اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

دسمبر ۲۰۱۹ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

بلامعاوضہ

سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور قرآنی حلقوں میں
قرآن حکیم کا ترجمہ سکھانے کی منفرد کتاب

تدریس القرآن ①

- صرف ایک پارہ پڑھنے سے سارے قرآن کا ترجمہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔
- پانچویں سے اوپر کی جماعتوں کے لیے موزوں
- جدید اور سائنٹفک انداز۔ عربی گرامر کی الجھنوں اور رٹے سے دور
- اساتذہ اور طلبہ (وطالبات) کے لیے الگ کتابیں
- اساتذہ کے لیے فری ٹریننگ

تدریس القرآن فاؤنڈیشن

97-A نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،

فون: 0309-4607124، 0333-4287640

خدمتِ قرآن میں ڈاکٹر محمد امین کا ایک اور منفرد کام

''قرآنی الفاظ کے ترجمے کی بجائے قرآن کی عربی عبارت کے مفہوم کی اردو میں منتقلی''

اسلاف اور جمہور مفسرین کی مطابقت کے ساتھ

رواں، سلیس اور شستہ اسلوب

صرف اردو ترجمہ پڑھیں تو بھی لطف آئے اور بات پوری طرح سمجھ میں آئے

اور تفسیر و حواشی سے بڑی حد تک بے نیاز کرے

پنج سورہ

الفاتحہ، یٰسٓ، الرحمن، الواقعہ، الملک و پارہ عمّ

سفید کاغذ اور مضبوط گتے کی جلد، صفحات ۷۶

ہماری لاگت مع ڈاک خرچ ۱۶۰ روپے

ہدیہ: خدمت قرآن میں آپ کو شریک کرنے کے لیے صرف ۱۰۰ روپے

بذریعہ: وی پی، منی آرڈر، موبی کیش (اکاؤنٹ نمبر 0306-4640366)

مکتبہ البرہان

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

❁ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰ صفحات
❁ اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰
❁ تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۱۶۷
❁ تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۰
❁ تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ ہینڈ بک و گائیڈ	۱۶۰
❁ تدریس القرآن ① برائے معلمین	۱۹۰
❁ تدریس القرآن ① برائے طلبہ و طالبات	۷۲
❁ پنج سورہ (اُردو تفہیم، ڈاکٹر محمد امین)	۷۶
❁ ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰
❁ نصابِ مدنیؒ	۴۰
❁ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳
❁ حقیقتِ تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۰
❁ ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۵۰
❁ مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل	۳۰۰
❁ اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۵
❁ اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۵
❁ عصرِ حاضر میں دین کا متوازن تصور	۸۳

ڈسکاؤنٹ سمیت
بدون ڈاک خرچ

مکتبہ البرہان، A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،
0309-4607124

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۲۳، شمارہ ۱۲، دسمبر ۲۰۱۹ء/ ربیع الاوّل ۱۴۴۱ھ

مشمولات

○فکر ونظر

مدحتِ پیمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم	علامہ محمد اقبالؒ	۴

○تعلیم، تربیت، تحقیق

۔علماء، محققین اور اسلامی تحریکوں کو درپیش علمی چیلنج	سید سعادت اللہ حسینی	۵
۔ نیا فیشن: برقعے میں رقص	پروفیسر عاصم حفی	۲۲
۔ دینی مدارس میں تجدد کہاں سے آرہا ہے؟	پروفیسر طارق بٹ	۲۴

○فہم اسلام

۔ ایک ملحد پی ایچ ڈی سکالر سے مکالمہ	رضوان خالد چوہدری	۲۷
۔ اقتدار یا اصلاحِ اقتدار	پروفیسر قاضی محمد ظفر الحق	۳۵
۔مسئلہ تصویر	مدیر	۴۲

○اسلام اور پاکستان

۔ پاکستان کا دینی منظر نامہ	پروفیسر ملک محمد حسین	۴۴
۔ دینی سیاسی جماعتوں کے موثر اور کامیاب ہونے کا منہج		۴۷

○اسلام اور مغرب

۔ مطالعۂ استشراق کے جدید منہج کی ضرورت؟	ڈاکٹر طفیل ہاشمی/ مدیر	۴۸
۔مغربی معاشرت کے آزار: تنہائی، افسردگی اور مایوسی	پروفیسر عاصم حفیظ	۵۱

○عالم اسلام

چین میں مسلمانوں پر مظالم کا آنکھوں دیکھا حال	ڈاکٹر شفیق انجم	۵۳

○تبصرۂ کتب

’’ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی اقبال شناسی‘‘	مدیر	۵۷

فکرونظر

نعت

لوح بھی تُو قلم بھی تُو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقر و جنید بایزید تیرا جمالِ بے نقاب

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو عشق حضور و اضطراب

اقبالؒ

اسلامی تحقیق

سید سعادت اللہ حسینی[۱]

علماء، سکالرز، محققین اور اسلامی تحریکوں کو درپیش علمی چیلنج

اسلامی تحقیقاتی ادارے اور جامعات (خصوصاً پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ کے اساتذہ وطلبہ) توجہ فرمائیں

[فاضل مصنف نے جماعت اسلامی کے اہل علم کے لیے یہ مقالہ لکھا تھا لیکن اس کے مخاطب درحقیقت چونکہ ساری امت کے اہل علم و تحقیق ہیں لہٰذا ہم نے اسی حوالے سے مضمون کی کچھ ایڈیٹنگ کر دی ہے۔مدیر]

آج اسلامی دعوت کی بڑی علمی ضرورت یہ ہے کہ اسلامی علم کلام کو ترقی دی جائے اور اسلامی عقائد کو فلسفے کی اعلیٰ ترین سطح پر ثابت کیا جائے۔ اُمت کے جدید تعلیم یافتہ اور ذہین طبقے کو فکری ارتداد سے بچایا جائے، ان کے ذہن وقلب میں اسلام پر یقین واعتماد کو بحال کیا جائے اوراس کے لیے گہری اور پائیدار بنیادیں فراہم کی جائیں۔

اسلامی عقائد و ایمانیات پر پختہ یقین پیدا کرنے کے لیے مولانا مودودیؒ نے اپنی کتابوں دینیات، خطبات اور 'اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر' میں عام فہم اور سادہ طریقے سے اسلام کے بنیادی عقائد کو عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے اور 'اسلامی نظامِ زندگی اوراس کے بنیادی تصورات' کے بعض مقالات اور تفہیم القرآن کے بہت سے مباحث میں انہی موضوعات کو انہوں نے زیادہ عالمانہ طریقے سے پیش کیا ہے۔ضرورت ہے کہ علم وفضل کے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا جائے۔

توحید، الحاد اور تشکیک

اسلامی عقائد کی بنیاد 'عقیدۂ توحید' ہے، یعنی ذاتِ باری تعالیٰ کا وجود اور اس کی وحدانیت اور خالقِ ارض وسما کی صفات۔ یہ مسئلہ زمانۂ قدیم ہی سے مذہبی اور غیر مذہبی طبقوں کے درمیان متنازعہ رہا ہے۔آج کی علمی دنیا میں بھی، سیکولر مغرب اور اسلام کے درمیان اصل

[۱] امیر جماعت اسلامی، ہند

فلسفیانہ اختلاف اسی مسئلے پر ہے۔ اللہ کا وجود اور صفات تسلیم ہو جائیں تو رسالت اور آخرت پر یقین پیدا کرنا آسان ہے۔

مولانا مودودیؒ کی کتابیں ایک عام تعلیم یافتہ فرد کو اللہ کے وجود پر قائل کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان کتابوں میں اُن دلائل سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، جو عہد وسطیٰ کے متکلمین، بالخصوص امام غزالی [۱۰۵۸ء۔۱۱۱۱ء] نے یونانی فلسفے کے توڑ کے لیے استعمال کیے تھے۔ مولانا نے ان کلاسیکل دلائل کو اپنے مخصوص طرزِ بیان اور جدید مثالوں سے نیا آہنگ دے کر جدید ذہن کے لیے انھیں قابلِ قبول بنا دیا ہے۔

یہ دلائل عام پڑھے لکھے لوگوں کے لیے تو کافی ہیں لیکن جنھوں نے مغربی فلسفوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان کا کم و بیش اثر قبول کیا ہے، ان کے لیے کام باقی ہے۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں ملحد مغربی فلسفیوں نے انھی دلائل کی کاٹ کی ہے۔ اللہ کے وجود کے اثبات میں مولانا مودودی نے گھڑی اور مشینوں کی جو مثال دی ہے، پہلے پہل یہ مثال برطانوی عیسائی فلسفی ولیم پیلے [۱۷۴۳ء۔۱۸۰۵ء] نے پیش کی تھی۔ گذشتہ ۲۰۰ برسوں میں یہ مثال مختلف اہلِ علم کے ہاں مختلف حوالوں سے بہ کثرت زیر بحث آچکی ہے۔

ڈیوڈ ہیوم [۱۷۱۱ء۔۱۷۷۶ء] سے لے کر رچرڈ ڈاکنز [پ:۱۹۶۱ء] تک درجنوں فلسفیوں نے اس پر جرح کی ہے اور رچرڈ ڈاکنز نے ایک مستقل کتاب صرف اس ایک دلیل کے رد میں لکھی ہے۔ برٹرنڈ رسل [۱۸۷۲ء۔۱۹۷۰ء] کے دلائل اچھے اچھے اہلِ ایمان کو متشکک کر دیتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں رچرڈ ڈاکنز، کرسٹوفر ہیچنز [۱۹۴۹ء۔۲۰۱۱ء] اور وکٹر جے اسٹینجر [۱۹۳۵ء۔ ۲۰۱۴ء] جیسے دسیوں بلند پایہ فلسفی ہیں، جنھوں نے الحاد کے حق میں دلائل کی وسیع عمارتیں کھڑی کی ہیں۔ یہ سب فلسفے، علمی دنیا میں الحاد، خدا بے زاری اور انتہاپسندانہ سیکولرزم کے لیے مضبوط بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ان فلسفوں کے مقابلے کے لیے اور جدید اسلوبِ نگارش میں ہمارا موجودہ اسلامی تحریری سرمایہ کسی صورت کافی نہیں ہے۔ میں ایسے کئی صالح، دین دار نوجوانوں سے واقف ہوں جو عمانویل کانٹ [۱۷۲۴ء۔ ۱۸۰۴ء] اور برٹرنڈ رسل کو پڑھ کر کئی کئی سال تشکیک اور سخت پریشانی کے عالم میں رہے۔ اس پس منظر میں یہ اسلامی دعوت کی اہم ترین

علمی ضرورتوں میں سے ہے کہ عالمانہ اور فلسفیانہ سطح پر الحاد کی کاٹ کی جائے اور بجا طور پر اللہ تعالیٰ کے وجود کو ثابت کیا جائے۔ یہ کام عہد وسطیٰ میں امام غزالی نے کیا تھا، جنھوں نے یونانی فلسفے کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔

مسیحی دنیا میں اس محاذ پر بڑا قابلِ قدر کام ہوا ہے۔ اگر اس سے استفادہ کرتے ہوئے بھی کچھ کتابیں لکھ دی جاتیں تو مفید کام ہوتا۔ اس طرح کی کچھ کوششیں ہوئی بھی ہیں۔ مثال کے طور پر ترکی کے دانش ور، ہارون یحییٰ [پ:۱۹۵۶ء] نے سائنسی دلائل کا سہارا لیتے ہوئے بہت قیمتی لٹریچر پیش کیا ہے۔ لیکن یہ دلائل بھی عام لوگوں کے لیے ہیں۔ ملحد فلاسفہ کی گتھیوں کو فلسفیانہ سطح پر حل کرنا ان کا مقصد بھی نہیں ہے۔ وحیدالدین خان صاحب [پ:۱۹۲۵ء] نے بھی ایک زمانے میں اس ذیل میں اچھی کوششیں شروع کی تھیں۔ اگر وہ اس کام کو جاری رکھتے تو شاید بڑا اہم کام ہوتا۔ لیکن بعدازاں خود ملامتی رنگ اپنانے کے نتیجے میں اس موضوع پر ان کا موجودہ لٹریچر بہت سطحی نوعیت کا ہے۔ اس سے اہلِ ایمان کے ایمان میں کہیں اطمینان اور کہیں تزلزل تو پیدا ہوسکتا ہے، لیکن کسی ملحد فلسفی کو قائل کرنے کا کام نہیں ہوسکتا۔

مولانا عبدالباری ندوی [۱۸۸۶ء-۱۹۷۶ء] کی کتب: برکلے اور اس کا فلسفہ، مذہب اور عقلیات، مذہب اور سائنس میں ان موضوعات پر گراں قدر مباحث ہیں۔ خاص طور پر کوانٹم میکانکس اور 'نظریۂ نسبیت' (Relativity) کے بعد کی فلسفیانہ صورتِ حال کے پیش نظر بعض اچھے نکات زیر بحث آئے ہیں۔ لیکن ایک تو یہ بحث کافی نہیں ہے اور دوسرے کافی قدیم ہے۔

امریکی مسیحی فلسفی ولیم لین گریگ [پ: ۲۳/اگست ۱۹۴۹ء] نے اسلامی علمِ کلام ہی کو مسیحی نقطۂ نظر اور سائنس و فلسفے کی جدید ترقیوں کی روشنی میں کافی ترقی دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود کے اثبات میں ان کے کام کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور ان کی ۳۰ سے زائد کتب، خاص طور پر ۱۹۷۹ء میں ان کی کتاب The Kalam Cosmological Argument(KCA) اللہ کے وجود کے اثبات پر بڑی گہری فلسفیانہ کتاب ہے اور ملحد فلسفیوں کے بیش تر دلائل کا پُرزور رد ہے۔

اسی طرح برطانوی فلسفی اینٹونی فلیو [۱۹۲۳ء۔۲۰۱۰ء] زندگی بھر ملحد رہے اور الحاد کے حق میں اور اللہ کے وجود کے رد میں تین درجن سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ یاد رہے انھیں 'دنیا کا بدنام ترین ملحد' کہا جاتا تھا، لیکن مرنے سے دو تین سال قبل انھوں نے اپنا ذہن بدلا اور مرتے مرتے، اللہ تعالیٰ کے وجود کے اثبات میں کتاب لکھ گئے۔ ان کی کتاب There is a God اس موضوع پر بہت گہری فلسفیانہ دستاویز ہے۔ عمانویل کانٹ اور ڈیوڈ ہیوم سے لے کر عصر حاضر کے معروف ملحدین تک کی ہر دلیل کا مسکت جواب اس کتاب میں موجود ہے۔ یہ کتاب چونکہ ایک ایسے فرد کی لکھی ہوئی ہے، جو عصرِ حاضر میں الحاد کا بڑا قدآور امام مانا جاتا تھا، اس لیے اس کی اہمیت دو چند ہوگئی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ولیم گریگ اور اینٹونی فلیو کے 'تصورِ خدا' میں اور اسلام کے 'تصورِ الٰہ' میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لیے ان کتابوں سے استفادہ محدود پیمانے پر ہی ہوسکتا ہے۔ اس لیے ابتدا میں کم از کم یہ ہونا چاہیے کہ فلسفے کے کچھ ذہین طالب علم، ان عیسائی فلسفیوں کے افکار سے استفادہ کرتے ہوئے اسلام کے 'تصورِ الٰہ' کے حق میں کچھ گہری کتابیں لکھیں اور دھیرے دھیرے یہ کاوشیں جدید اسلامی فلسفے کی ایک مستقل شاخ بن جائیں۔

اسلامی نظریات کی جدید تشکیل

مولانا مودودیؒ نے واضح طور پر تھیوری اور پیراڈائم [مثالی نمونۂ فکر] کی سطح پہ کام کیا ہے۔ پھر اسلام کی متفرق تعلیمات ہی بتانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اسلامی تصورات کی بنیادوں پر مکمل اور منظم نظریہ کھڑا کیا ہے۔

تھیوری، تصورات کے منظم ڈھانچے کا نام ہے۔ ایک ذہین مفکر جب واقعات اور احوال پر غور کرتا ہے، تو ان کی توجیہات کا ایک ایسا منظم خاکہ اور ایک ایسی آفاقی اسکیم تیار کرتا ہے، جس کی بنیاد پر اس طرح کے بے شمار واقعات اور احوال کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ مستقبل سے متعلق پیش گوئی کی جاسکتی ہے اور آیندہ چند در چند واقعات کے متعلق کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

اکثر تھیوری میں تجریدی (abstract) تصورات پیش کیے جاتے ہیں اور انھیں مخصوص

(اور اکثر منفرد اور نئی) اصطلاحات کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مولانا مودودی نے خلافت راشدہ اور بنواُمیہ کی تاریخ اور اس زمانے میں پیش آئے واقعات کی بنیاد پر خلافت سے ملوکیت کی طرف سفر کی ایک پوری تھیوری تعمیر کی اور اس تھیوری کو خلافت، ملوکیت وغیرہ اصطلاحات کے استعمال سے واضح کیا۔ یا تحریکِ آزادیِ ہند کے زمانے کے احوال و واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے اسلامی ریاست و سیاست کی تھیوری تعمیر کی۔ ابن خلدون [۱۳۳۲ء۔۱۴۰۶ء] نے 'عصبیہ' (Social Cohesion) کی تھیوری پیش کی، یا امام غزالی نے اخلاق کی تھیوری پیش کی تھی اور 'شہوت'، 'حکمت' اور 'غضب' کی اصطلاحات سے اس تھیوری کی وضاحت کی تھی۔

تھیوری کی تعمیر ایک بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ تھیوری بن جائے تو تفصیلات کا تعین بھی آسان ہو جاتا ہے اور اثبات بھی۔ کارل مارکس کا 'ورلڈ ویو' [تصورِ جہاں] ہم کو معلوم ہے۔ اسی 'تصورِ جہاں' کی بنیاد پر اس نے تاریخ میں 'جدلیاتی مادیت' (Dialectical Materialism) کی تھیوری پیش کی۔ اب ایک مارکسی مفکر کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ اس تھیوری کی بنیاد پر ہر تاریخی واقعے کی توجیہ کرے اور مستقبل کی پیش گوئی کرے۔ یوں سماجیات میں اس نے 'معاشی جبریت' (Economic Determinism) کی تھیوری پیش کی۔ نو مارکسی مفکرین نے اس میں ترمیم کی اور فرانسیسی مفکر لوئی التھیوز [۱۹۱۸ء۔۱۹۹۰ء] نے 'زائد جبریت' (Over determinism) اور 'نسبتی خودمختاری' (Relative Autonomy) جیسی نئی سماجی تھیوریاں تشکیل دیں۔

آج اسلامی فکر کے سامنے ایک بڑا اہم چیلنج یہ ہے کہ Theory construction [تعمیر ژرف اندیشی] کے اس کام کو آگے بڑھایا جائے۔ اسلامی معاشیات کے باب میں مولانا مودودی، ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، پروفیسر خورشید احمد، ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا، ڈاکٹر انس زرقا، محمد اکرم خان، ابوالحسن بنی صدر، باقر الصدر وغیرہ کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن اسلامی معاشیات کو ابھی بہت سے حل طلب مسائل اور چیلنج درپیش ہیں، جس کے لیے نئی نسل کو آگے بڑھنا ہے۔ تعلیم میں فلسطینی نژاد اسکالر ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی شہید [۱۹۲۱ء۔۱۹۸۶ء] اور دیگر بے شمار دانش وروں اور اداروں کی گراں قدر کوششوں اور سیّد محمد نقیب العطاس

[پ:۱۹۳۱ء] کی چشم کشا تحریروں کے باوجود یہ امر واقعہ ہے کہ منظم تھیوری کی تشکیل کا کام ابھی باقی ہے۔ غالباً ابھی تک اس سطح کا کام نہیں ہے کہ ہم اسے Educational Essentialism [تدریسی ماہیت گری]، یا Criticial Pedagogy [تنقیدی فنِ تدریس] یا ۱۹۱۱ء سے رُوبہ عمل ’مونٹی سوری تدریسی طریقے‘ یا ۱۹۱۹ء سے متعارف ’والڈروف تدریسی عمل‘ وغیرہ کے مقابلے میں پیش کرسکیں۔ تاریخ اور تہذیب میں بھی یہ کام نامکمل ہے۔ نفسیات میں سوڈان سے عالی مرتبت ڈاکٹر مالک بدری [پ:۱۹۳۲ء] کی شان دار کوششوں کے باوجود، سگمنڈ فرائڈ [۱۸۵۶ء-۱۹۳۹ء] کے گمراہ کن نظریات کا متبادل پیش کیا جانا باقی ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ معاصر اسلامی لٹریچر میں ’سماج‘ یا ’معاشرہ‘ کی کوئی مبسوط تھیوری تشکیل نہیں پاس کی۔ حالیہ دنوں میں امریکی ایرانی مصنف سیّد حسین نصر [پ:۱۹۳۳ء]، ترک مصنف فتح اللہ گولن [پ:۱۹۴۱ء] اور عرب نژاد طارق رمضان [پ:۱۹۶۲ء] نے اور ماضی قریب میں ایران سے استاذ مرتضیٰ مطہری [۱۹۱۹ء-۱۹۷۹ء] اور ڈاکٹر علی شریعتی [۱۹۳۳ء-۱۹۷۹ء] نے اس ذیل میں کچھ اچھی تھیوریاں ضرور پیش کی ہیں، لیکن اسلامی سماجی تشکیلِ نو کے لیے غالباً یہ نظریات تحریکِ اسلامی کے فکر کی اطمینان بخش نمایندگی نہیں کرتے۔

ظاہر ہے کہ تھیوری اور خاص طور پر ابن خلدون، امام غزالی اور کارل مارکس وغیرہ کی متذکرہ طرز کی گرینڈ تھیوریوں (grand theories) کی تشکیل ایک عبقری کام ہے اور عبقری مفکرین روز روز نہیں پیدا ہوتے۔ لیکن اس طرح کے بڑے مفکرین کے دیے ہوئے اشارات کی بنیاد پر اجتماعی کوششوں اور اجتماعی دانش کے ذریعے اُس کام کی تکمیل بآسانی ہوسکتی ہے، جو انھوں نے چھوڑا ہے۔ ’نومارکسیت‘ میں ’فرینکفرٹ اسکول‘، ’نیولبرلزم‘ میں ’شکاگو اسکول‘ وغیرہ، درحقیقت افراد کے کارنامے نہیں ہیں بلکہ اجتماعی اداروں کے کارنامے ہیں، جن کی تھیوریوں نے دنیا پر بڑے گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ خود ہمارے حلقوں میں اسلامی معاشیات میں جو کام ہوا ہے وہ زیادہ تر اجتماعی سطح پر ادارہ جاتی کوششوں کے ذریعے ہوا ہے۔ اس لیے کوشش کی جائے تو اسلامی فکر میں بھی یہ کام ہوسکتا ہے۔

اسی طرح ہم دنیا کو بہت شرح و بسط کے ساتھ یہ نہیں بتا سکے کہ ہمارے خوابوں کی دنیا کیسی ہوگی؟ مراد یہ ہے کہ ہمارے بہت سے خواب ابھی بھی بہت غیر واضح ہیں۔ اس عدم وضاحت کی وجہ سے مزاحم اور متحارب گروہوں میں سے کوئی یہ سمجھتا ہے کہ: ''شاید ہم دنیا کو محض ٹائم مشین میں بٹھا کر ۱۴۰۰ برس پہلے کے تمدن میں لے جانا چاہتے ہیں''۔ اور کسی کا خیال یہ ہے کہ: ''ہماری منزل غالباً ساری دنیا کو اسامہ بن لادن اور طالبان کا افغانستان بنا دینا چاہیے''۔ کوئی ہمارے حق میں بہت کشادہ دل واقع ہوا تو یہ سمجھتا ہے کہ: ''ہم آیت اللہ خمینی والا ایران چاہتے ہیں''۔ حالانکہ ہمارے بارے میں یہ تینوں مفروضے ہرگز درست نہیں ہیں، اور منفی سوچ کے مظہر ہیں۔

گویا کہ نظریاتی تحریکوں کی ایک بڑی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ وہ واضح خواب دیکھیں اور دنیا کو وہ واضح خواب دکھائیں۔ خواب دکھانے کا یہ کام بہت وسیع الاطراف اور ہمہ تخصصی (multi-disciplinary) معرکہ ہے۔ ۲۰ ویں صدی کے نصف اوّل میں کمیونسٹوں نے یہ کام بہت مؤثر طریقے سے انجام دیا تھا۔ اس خواب کی پیش کاری کے لیے فکر و فلسفے سے لے کر لوک گیتوں اور تھیٹر اور ناچ کی محفلوں تک کوئی ذریعہ انھوں نے نہیں چھوڑا تھا۔ فلسفہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، معاشیات، نفسیات، ادبیات، حتیٰ کہ صنفیات وغیرہ میں ان کی اپنی مستقل تھیوریاں تھیں۔ پالیسیوں اور مسائل پر ان کے واضح موقف تھے اور اس کی تائید میں بھرپور لٹریچر تھا، فلمیں تھیں، ناول، افسانے، شاعری تھی اور ادب عالیہ و فنون لطیفہ کے ذریعے عام ناخواندہ اور خواندہ خواتین و حضرات کو بھی انھوں نے اپنی مطلوب دنیا کی جھلک دکھا دی تھی۔ اُردو شاعری ہی میں دیکھ لیجیے، فیض احمد فیض، اسرار الحق مجاز، ساحر لدھیانوی وغیرہ نے کس خوب صورتی سے 'پرولتاری آمریت' [نام نہاد جمہوری] پر مبنی دنیا کے مناظر دکھائے تھے:

مجبور بڑھاپا، جب سونی راہوں کی دھول نہ پھانکے گا
معصوم لڑکپن، جب گندی گلیوں میں بھیک نہ مانگے گا
حق مانگنے والوں کو جس دن، سولی نہ دکھائی جائے گی

وہ صبح کبھی تو آئے گی

سنسار کے سارے محنت کش کھیتوں سے نکلیں گے

بے گھر، بے دَر، بے بس انساں، تاریک بلوں سے نکلیں گے

دنیا امن اور خوش حالی کے پھولوں سے سجائی جائے گی

وہ صبح ہمیں سے آئے گی

تاہم، ہمیں کمیونسٹوں کی طرح ایسی سستی نعرے بازی کی بجائے متوازن اور مؤثر انداز سے: عدل، سچائی اور آخرت میں جواب دہی کے احساس کے زیر سایہ، اس میدان میں بہت زور وشور سے پیش رفت کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے تھیوریوں کی تعمیر کا کام ہو۔ ان کی روشنی میں پالیسیوں پر اُٹھنے والے سوالوں کا جواب (response) ہو اور متبادل آئیڈیاز کی تخلیق اور پیش کش کا کام ہو۔ ادب عالیہ کو بڑے پیمانے پر ہمارے خوابوں کی دنیا دکھانے کے لیے ادبی لطافتوں کی بھرپور رعایت اور تفہیم کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ اس غرض کے لیے فلمیں بنیں۔ فائن آرٹ کا استعمال ہو۔ یہاں تک کہ لوگ ہمارے خوابوں کو اور ہمارے خوابوں کی دنیا کو سمجھ جائیں اور ان خوابوں میں عملی زندگی کو ڈھالنے کے لیے اُمنگ محسوس کریں۔ یہ کام عمومی طور پر عالمی سطح پر بھی ہونا چاہیے اور ہر ملک کے مخصوص احوال کے پس منظر میں بھی۔

جائزے کا ایک زاویہ یہ بھی ہونا چاہیے کہ مستقبل قریب میں ہمارے اور باقی دنیا کے درمیان اصل بحث طلب موضوعات کیا ہیں اور کیا ہو سکتے ہیں؟ ان موضوعات پر بھرپور تیاری کی ضرورت ہے۔ یہ جائزہ ملک کی سطح پر بھی ہونا چاہیے اور عالمی سطح پر بھی۔

عصر حاضر میں مذہب کا کردار

ابتدا میں وجودِ باری تعالیٰ کی بات آچکی ہے۔ اس کے بعد اہم ترین متنازع موضوع 'مذہب اور مذہب کے دائرے' کا موضوع ہے۔ انسان کی اجتماعی زندگی میں مذہب کا فعال کردار، انسانیت کے لیے مفید ہے یا نقصان دہ؟ یہ سوال آیندہ کئی عشروں تک دنیا کے دانش ورانہ اُفق پر چھایا رہے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خالص عالمانہ طریقوں سے اور مخالف

ذہن اور اس کے تحفظات کو اچھی طرح سمجھ کر اس بحث میں فعال حصہ لیا جائے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ: ''کفر جو چاہتا ہے کرتا پھرے، ہمیں کیا؟'' نہیں۔ ''کفر جو چاہے کرتا پھرے'' کا اثر خود ہماری نسلوں، عام انسانوں اور دنیا کے مستقبل پر پڑتا ہے۔ اس لیے اُس کو نظرانداز کرنا اُمتِ وسط کی منصبی ذمہ داری سے انحراف کے معنوں میں آتا ہے۔

اب دنیا کا منظرنامہ بڑی حد تک بدلا ہوا ہے۔ سیکولرزم کے حق میں پہلے جیسا جوش و خروش باقی نہیں ہے۔ فرانس جیسے ملک کا سابق صدر فرانس نکولاس سرکوزی [پ: ۱۹۵۵ء] جیسا متشدد سیکولرسٹ بھی برسرِعام یہ کہہ رہا ہے کہ: ''مذہب کی بنیاد کے بغیر وجود میں آنے والی اخلاقیات ناپائےدار ہیں اور سوسائٹی کے لیے خطرناک بھی''۔ دوسری طرف مذہب سے بغاوت پر مبنی، مادر پدر آزاد اجتماعی زندگی کا ۳۰۰ سالہ طویل تجربہ، اپنی تمام حشرسامانیوں کے ساتھ دنیا کے سامنے موجود ہے۔ ان تین چار سو برسوں میں خود مذہب کے صحیح وغلط اور اجتماعی زندگی پر اس کے اثرات کا ریکارڈ بھی موجود ہے۔ ان تجربات کی بنیاد پر بہت سے سیکولر دانشور بھی مذہب اور ریاست کے درمیان تعلق کی ازسرِنو تعیین کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اس بحث کو تحریکی دانش ور نئے زاویے دیں، اور یہ ثابت کریں کہ اکیسویں صدی کے باشعور انسان کو مذہب کے تئیں خوف و احتیاط کے اس رویے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، جو یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے زمانے میں اختیار کیا گیا تھا، اور یہ کہ اجتماعی زندگی میں مذہب کا تعمیری اور مثبت کردار انسانیت کے بہت سے مسائل کو حل کرسکتا ہے اور اس کا عملی ماڈل صرف اسلام پیش کرسکتا ہے۔ اس سلسلے کی جو اُلجھنیں جدید سیکولر ذہن محسوس کرتا ہے، انھیں اور زیادہ تفصیل اور دلائل کے ساتھ رفع کرنے کی ضرورت ہے، اور اس بات کی ضرورت ہے کہ ان اُلجھنوں کا قابلِ عمل حل پیش کیا جائے۔

اسی سے ملتی جلتی ایک بحث، مختلف مذاہب کے ساتھ تعلق اور تکثیری معاشروں میں رویوں کی بحث بہت اہمیت کی حامل ہے۔ عام ذہن کسی ایک مذہب کی حقانیت پر اصرار اور باقی مذاہب کے ردّ و ابطال کو پسند نہیں کرتا۔ اپنے مذہبی عقیدے کو واحد سچائی سمجھنا مذہبی جنون (fanaticism) سمجھا جاتا ہے اور یہاں تکثیریت (Pluralism) کے اُس فلسفے کو قبولِ عام حاصل ہے، جس میں سماج یا معاشرے کو شربت کے ایک ایسے جار سے تشبیہہ دی جاتی

ہے، جس میں مختلف مشروبات مل کر اور اپنا منفرد رنگ و مزا کھو دیتے ہیں اور پھر ایک نیا رنگ اور نیا مزد پیدا کرتے ہیں۔ اب نئے عالمی حالات میں اور خاص طور پر پوسٹ ماڈرن فلسفوں کے پس منظر میں یہ ذہن دنیا میں قبولِ عام اختیار کرتا جا رہا ہے۔ دنیا کا یہ رویہ مذہب کے علاوہ کسی اور علمی محاذ پر نہیں ہے (پوسٹ ماڈرن فلسفوں کی استثنا کے ساتھ)۔

فلسفہ، مختلف سماجی علوم، حتیٰ کہ نظریاتی سائنس میں بھی مختلف متضاد تھیوریوں پر زوردار بحثیں جاری ہیں۔ لوگ اپنے موقف ہی کو صحیح سمجھتے ہیں اور متضاد موقف کو غلط سمجھتے ہیں، اور اسے تنقید و جرح کا موضوع بناتے ہیں۔ البتہ اس 'غلط' موقف کو اختیار کرنے کے اپنے مخالفین کے حق کو بھی تسلیم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگر یہ رویہ راست فکری سے اپنایا جائے تو اسی مجادلے سے سچائی نکھر کر سامنے آسکتی ہے، اور دیگر لوگوں کو اپنے موقف کے تعین میں مدد مل سکتی ہے۔

اسلام، دین و مذہب کے معاملے میں بھی اسی معقول علمی رویے کا قائل ہے۔ اسے بجا طور پر اپنی سچائی پہ اصرار ہے اور وہ اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کی حقانیت کو باقی دنیا پر واضح کریں۔ اسلام چاہتا ہے کہ جو لوگ اس سچائی کے قائل نہیں ہیں، ان کے ساتھ مکالمہ و مجادلہ ہوتا رہے۔ لیکن اگر کوئی ماننا ہی نہیں چاہتا تو اس دنیا میں، اسلام اسے نہ ماننے کا اختیار بھی دیتا ہے۔ دنیا کو دلائل کے ساتھ یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ مذہب سمیت تمام مختلف فیہ معاملات میں یہی معقول اور مطلوب رویہ ہے۔

تاہم، مخالف موقف کو بھی صحیح سمجھنے کا مطالبہ اور اس پر اصرار ایک غیر فطری اور نامعقول مطالبہ ہے جو بدترین نفاق کو جنم دیتا ہے۔

مذہب کے معاملے میں بحث و مجادلے سے گریز اور سبھی مذاہب کو بیک وقت صحیح سمجھنے پر اصرار کی روش کو ہمیں علمی سطح پر تنقید کا موضوع بنانا چاہیے۔ ڈاکٹر عبدالحق انصاری، مولانا فاروق خان اور مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحبان نے اس تصور پر جرح کی ہے، لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ دیگر مذہبی فلسفیوں کے دلائل کا جائزہ لے کر اور زیادہ تفصیل اور گہرائی کے ساتھ اس مسئلے کا جائزہ لیا جائے۔

مرد اور عورت کا تعلق اور جدید رجحانات

انسانی معاشرت اور اجتماعی اخلاقیات کی سطح پر ایک اہم بحث طلب موضوع جنسی

رجحانِ طبع (sexual orientation) ہے۔ اب یہ بات مشرق ومغرب کے تقریباً تمام بااثر طبقات میں تسلیم کر لی گئی ہے کہ: ’’افراد کے اندر کئی طرح کے جنسی رجحانات فطری طور پر پائے جاتے ہیں اور ہم جنس پرست مرد اور عورتوں کا وجود ایک فطری حقیقت ہے اور انھیں اپنے جداگانہ جنسی رجحان کے ساتھ ویسے ہی رہنے کا حق حاصل ہے، جیسے مذہبی ولسانی اقلیتوں کو اپنے جداگانہ مذہب یا جداگانہ زبان کے ساتھ رہنے کا حق حاصل ہے‘‘۔ اس کے پہلو بہ پہلو ’جنسی اقلیت‘ کی اصطلاح بھی ساری دنیا میں چل پڑی ہے اور ان کے اس رجحان کے خلاف کوئی بھی بات ’اقلیت دشمنی‘ باور کرائی جارہی ہے۔ کوئیر تھیوری (Queer Theory: ’خبطی نظریہ‘) کی ترویج کی منصوبہ بند کوششیں کی جارہی ہیں اور علمی حلقوں میں اسے قبولِ عام بھی حاصل ہوتا جارہا ہے۔

اس تھیوری کی وکالت میں سماجی سائنس دان ، ماہرین نفسیات، ماہرین حیاتیات، ماہرین طب وعلم الابدان، ماہرین قانون اور علماے اخلاقیات وفلسفہ وغیرہ پر مشتمل اہلِ علم کا بڑا گروہ پوری دنیا میں کام کررہا ہے۔ یہ بات اب تیزی سے مشرقی ممالک کے اشرافیہ میں بھی قبولِ عام اختیار کرتی جارہی ہے۔ مثال کے طور پر ہندستان میں ہم جنسی کے خلاف باقاعدہ قانون موجود ہونے کے باوجود، عدالتیں اس عمل کو نہ صرف یہ کہ جرم نہیں سمجھتیں، بلکہ اُلٹا اس عمل کی ہلکی سے ہلکی مخالفت یا قانون کے نفاذ کو ’سنگین اور خلافِ انسانیت جرم‘ سمجھتی ہیں۔ عیسائی مذہبی قیادت اس مسئلے پر تقریباً سرنگوں ہوچکی ہے اور مغربی دنیا میں مسلمان اہلِ علم کی ایک قابلِ لحاظ تعداد، انتہائی مدافعانہ اور معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور نظر آتی ہے۔ جان لینا چاہیے کہ آج یہ مغرب میں کھلے عام اور مشرق میں صرف بالائی سطح پر زیر بحث اور زیر عمل رویہ دکھائی دے رہا ہے، تو ممکنہ پیش بندی نہ ہونے کی صورت میں، یہ آنے والے برسوں میں مسلم معاشروں کا ایک عمومی مسئلہ بن جائے گا۔

ان حالات میں یہ موضوع ایک وسیع اور ’ہمہ تخصصی منصوبے‘ (multi disciplinary project) کا تقاضا کرتا ہے۔ اس بات کو بطور ایک ’فرضیہ‘ (hypothesis) لینا چاہیے کہ ’’غیر محرمات کے درمیان نکاح کے ذریعے مرد وعورت کے درمیان جنسی تعلق کے سوا تمام جنسی رویے اور رجحانات غیر فطری اور انسانی جسم، معاشرے اور

آخرکار تہذیب کے لیے نقصان دہ ہیں''۔ میڈیکل سائنس، نفسیات اور میڈیکل نفسیات (Psychiatry)، سماجی سائنس وغیرہ کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں خالص علمی طریقے سے اس مفروضے اور موقف کو ثابت کیا جانا چاہیے۔

جدید تصوراتِ زندگی اور اسلام

دنیا میں جو مختلف نظریات پائے جاتے ہیں اور عالمی سیاست، معیشت و معاشرت کے بارے میں جو مختلف نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں، ان کا محاکمہ بھی ضروری ہے۔ ان میں سے بعض نظریات خود مسلمان نوجوانوں پر بھی گہرے اثرات چھوڑ رہے ہیں۔ دنیا کی کوئی نظریاتی تحریک معاصر افکار کو نظرانداز کرنے اور خاموشی کی روش اختیار نہیں کرسکتی۔ یہ ہماری دعوتی اور تحریکی ضرورت ہے کہ ہم ان کا نوٹس لیں اور ان کی اُلجھنوں کو رفع کریں۔ معاشیات وسیاسیات میں سب سے اہم اور طاقت ور نظریہ 'نوسرمایہ داری' کا نظریہ ہے۔ ان تفصیلات کا تعین ابھی باقی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظم کی ناانصافیوں کا ازالہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اور اس ذیل میں ہمارا 'تصورِ بصیرت' (vision) کیا ہے؟

اس نظام کے متبادل کے طور پر کئی نظریات دنیا میں بہت شدومد کے ساتھ پیش ہو رہے ہیں۔ ان میں سرفہرست 'مارکسیت' کی نئی تعبیر 'نومارکسیت' (Neo-Marxism) ہے۔ 'مارکسیت' کے جن عناصر پر ہم اب تک تنقید کرتے آئے ہیں، ان میں سے بہت سارے عناصر سے نومارکسی مفکرین نے اعلان براءت کرلیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اب اس بدلے ہوئے رُوپ سے ہمارا کیا تعامل ہو؟ ان میں اور ہم میں مشترک اُمور کیا ہیں اور کیا اُمور مختلف فیہ ہیں؟ ان پر کام کی ضرورت ہے۔

ایک اور متبادل جو پوری دنیا میں بہت پُرزور طریقے سے پیش ہو رہا ہے، وہ لبرٹیرین ازم (Libertarianism: شخصی آزادخیالی) کی مختلف شاخیں اور مختلف نظریاتی دھارے ہیں۔ انارکزم، نیوانارکزم، میوچلزم وغیرہ جیسے خیالات نے اسلامی دنیا سمیت پوری دنیا میں پڑھے لکھے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو متاثر کر رکھا ہے۔

عالمی سطح پر نوم چومسکی [پ: ۱۹۲۸ء] جیسا دانش ور ان افکار کا پُرجوش مبلغ ہے۔ اسی

طرح ارون دھتی راے [پ: ۱۹۶۱ء] جیسے بااثر مصنّفین اس فکری دھارے سے وابستہ ہیں۔ ان سیاسی وسماجی نظریات کے علاوہ، سماجی سطح پر 'اکولوجی موومنٹ' (جس نے کئی سیاسی وسماجی تنظیموں، حتیٰ کہ یورپ کی 'ارتھ لبریشن فرنٹ' جیسی دہشت گرد تنظیم کو بھی جنم دیا ہے)، طرزِ زندگی کی سطح پر ویجین موومنٹ، تعلیم کی سطح پر 'ڈی اسکولنگ' اور 'ان اسکولنگ' کی تحریک، 'طرف داریِ نسواں' (Feminism) کے مختلف روپ بشمول 'اسلامی طرف داریِ نسواں' (Islamic Feminism) وغیرہ دسیوں فلسفے ہیں، جن کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے ان میں سے ہر ایک کا نوٹس لینے کی ضرورت نہ ہو، لیکن جو خیالات انسانی آبادی کے قابلِ لحاظ حصے کو متاثر کر رہے ہوں اور خود مسلم نوجوان بھی جن کا اثر قبول کر رہے ہوں، ان پر خاموشی ممکن نہیں ہے۔

مستحکم خاندان کا چیلنج

بحث طلب موضوعات کے علاوہ اس جائزے کی بھی ضرورت ہے کہ: ہماری وہ کیا چیزیں ہیں، جن کی باقی دنیا ضرورت مند ہے اور اس میں کشش محسوس کر سکتی ہے؟ اس وقت ایک طرف ساری دنیا میں خاندان کی ضرورت کا احساس پیدا ہو رہا ہے اور دوسری طرف اسی تیزی سے ساری دنیا میں خاندان کا ادارہ زبردست ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ یاد رکھیے، خاندان، اسلام کا آخری قلعہ ہے۔ مغربی دنیا کے بعد مشرقی دنیا میں بھی خاندان کے ادارے کا قتل عام شروع ہو چکا ہے۔ جاپان اور جنوب مشرقی ایشیا تو بہت پہلے ہی شکار ہو چکے ہیں۔ اب بڑی تیزی سے چین، ہندستان، عرب اور دیگر بڑے مسلم ممالک کے شہری علاقوں میں بھی 'روایتی مشرقی جنسی اخلاقیات' زبردست انحطاط کی شکار ہیں اور 'یک نفری خاندان' (single parent family)، بن باپ کے بچے، ہم جنس خاندان، بنا شادی کے عارضی جوڑے، وغیرہ جیسی اصطلاحات ان شہروں کے لیے اجنبی نہیں رہیں۔ مگر دوسری طرف خود مغربی ملکوں میں کئی دانش ور اب یہ بات ثابت کر رہے ہیں کہ: ''مستحکم خاندان کے بغیر معاشرے کی ترقی و استحکام ممکن نہیں''۔

ان حالات میں مستحکم خاندان اور خاندانی سکون، آنے والے زمانوں میں اسلام کی بہت بڑی قوت اور اسلام کی کشش کا ایک اہم سبب ثابت ہوگا، کیونکہ اس بکھری ہوئی صورتِ

حال کو سنبھالنے کے لیے ویسا طاقت ور بیانیہ اور نظام دوسروں کے ہاں ناپید ہے۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم خاندان کے زبردست وکیل اور عالمی سطح پر تحفظ خاندان کے طاقت ور نگہبان کے طور پر سامنے آئیں۔ خاندان کی اہمیت پر موٴثر کتابیں لکھی جائیں اور اس بات کو مستحکم سائنسی دلائل سے ثابت کیا جائے کہ خاندان، انسانی معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے اور یہ کہ خاندان کا بس ایک ہی مطلب ہے، اور وہ یہ ہے کہ مرد و عورت کے روایتی طور پر مخصوص صنفی اور سماجی کرداروں کو تسلیم کیا جائے اور اس بنیاد پر قانونی طور پر تسلیم شدہ مرد شوہر اور عورت بیوی مل کر اپنے بچوں کی پرورش کریں۔ نام نہاد غیر روایتی خاندان سے، خاندان کی تشکیل اور انسانی تہذیب کی تعمیر کا کوئی مقصد حاصل نہیں ہوسکتا، اور خاندان کی بقا کا کوئی راستہ اسلامی اخلاقیات کے سوا ممکن نہیں ہے۔

جائزے کا ایک زاویہ یہ بھی ہونا چاہیے کہ نئے حالات میں مسلم اُمت اور خصوصاً مسلم نوجوان کو کس قسم کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں چند گوشوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں:

ایک اہم موضوع خود مسلم خاندان کی تفصیلات کا موضوع ہے۔ نئے حالات میں مسلم خاندان کے خدوخال کے تعین کے لیے اسلامی فقہ اور اسلامی سماجیات، دونوں سطحوں پر اجتہادی کام کی ضرورت ہے۔ عورت کا سماجی کردار کیا ہو؟ خواتین کی تعلیمی اور کیریر کی ترجیحات کیا ہوں؟ مسلم خاندان میں میاں بیوی اور بچوں کے علاوہ دیگر رشتہ داروں سے تعلق کی کیا نوعیت ہو؟ کیا خاندان نیوکلیائی ہو یا جائنٹ، یا دونوں کے امتزاج سے کوئی نئی صورت بنے؟ حتیٰ کہ مسلم خاندان میں ٹی وی اور انٹرنیٹ کو کیا مقام ملے؟ اس کے حدود و قیود کیا ہوں؟ (کہ میڈیا ہماری انفرادی اور خانگی زندگی میں بہت بڑا حصے دار بن کر انسانی زندگی کے بہترین اوقات کا مالک بن چکا ہے)۔ اس طرح کے دسیوں موضوعات ہیں، جن پر یا تو سرے سے کام نہیں ہوا ہے، یا صرف روایتی اور چلتی باتوں کی تکرار ہو رہی ہے اور نئے حالات کے لحاظ سے اجتہادی کوششیں نہیں ہوئی ہیں، یا تفصیلی وضاحت کا فقدان ہے، یا پھر محدود دائرے میں صرف فقہی بحث ہے۔ مسائل کے سماجیاتی (sociological) اور گہرے علمی تجزیے کا فقدان تو بہر حال پایا جاتا ہے۔

عورت کے رول اور کردار پر مولانا مودودی کی کتاب پردہ اور مولانا سیّد جلال الدین عمری کی کتابیں مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ، اور عورت اسلامی معاشرہ میں بڑی اہم تصنیفات ہیں۔ لیکن ان تصنیفات کے مخاطب زیادہ تر اسلام کے معترضین ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ان کتابوں میں اکیسویں صدی کی مسلمان خاتون کے اُس فعال حرکیاتی، سماجی وتحریکی کردار کی نہ جھلک ملتی ہے اور نہ اس کی توجیہہ ہے، جو عملاً ہمیں ساری مسلم دنیا میں اور جماعت اسلامی کے بشمول دنیا بھر کی اسلامی تحریکات میں نظر آ رہا ہے۔

اسی طرح جناب جلال الدین عمری کی کتاب اسلام کا عائلی نظام اسلامی خاندان کے متعدد پہلوؤں پر قیمتی رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ جسٹس ملک غلام علی نے ماہ نامہ ترجمان القرآن لاہور میں اور مولانا رضی الاسلام ندوی نے زندگی نو دہلی میں، ان اُمور سے متعلق بعض سوالات کے فقہی نقطۂ نظر سے جو جواب دیے ہیں، وہ بھی بہت اہم ہیں۔ اسلامی فقہ اکیڈمی دہلی کے سیمی نار میں پیش کردہ مقالات اور تجاویز بھی نہایت گراں قدر ہیں، لیکن یہ سب باتیں بہت اختصار کے ساتھ کہی گئی ہیں۔ ان متفرق باتوں میں جدید دور میں اسلامی خاندان سے متعلق کچھ اشارات ضرور ملتے ہیں، مگر ایک مفصل اور مربوط خاکہ اور تھیوری نہیں ملتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان اشارات پر کام آگے بڑھے اور جدید حالات کے تناظر میں اسلامی خاندان کی تفصیلی ہیئت نکھر کر سامنے آئے۔

اسلامی خاندان سے متعلق ہی ایک اہم مسئلہ مسلم خواتین کے بعض مسائل اور ان مسائل کے حل کی راہ میں، مختلف مقامات پر رواجی، قبائلی اور روایتی پرسنل لا کی جانب سے درپیش رکاوٹوں کا مسئلہ ہے، جن پر ہمارے ملک کے نام نہاد 'روشن خیال' طبقے مبالغے کے ساتھ متوجہ کرتے رہے ہیں۔ ان میں ایک اہم مسئلہ شوہر کی جانب سے بیوی پر ناروا ظلم اور اس ظلم کی صورت میں نجات کی کسی راہ کا نہ ہونا ہے۔ مولانا مودودی نے اس سلسلے میں حقوق الزوجین میں بہت جرأت مندانہ موقف اختیار کیا تھا۔ لیکن اس موقف پر کام آگے نہیں بڑھ سکا اور بات وہیں رُک کر رہ گئی ہے۔

اگرچہ ہمارے کئی زعما باوجود بے شمار مطالعات اور اعداد وشمار کے، اس مسئلے کے وجود سے ہی انکار کرتے ہیں، لیکن ہم سب کے عمومی مشاہدات بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ

مسلم سوسائٹی میں یہ مسئلہ موجود ہے۔ اگر اس میں کوئی شک ہے، تو ہم خود سائنٹفک مطالعہ اور سروے کرا سکتے ہیں۔ بہر حال، اس مسئلے کو نظر انداز نہیں کر سکتے، اور نہ اس مسئلے کا حل ثالثی عدالتوں سے ممکن ہے۔ نہ ان عدالتوں کی تعداد کافی ہے اور نہ پیشہ ورانہ تربیت کے بغیر قاضی ان مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس طرح کے مسائل کا قابلِ عمل حل، شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے، لیکن اجتہادی بصیرت اور جرأت کے ساتھ تلاش کیا جائے اور اسلامی تحریک اس عمل میں قائدانہ کردار ادا کرے۔ ایسا کرتے ہوئے دارالعلوموں کے مراکز فتویٰ کے جبر سے آزاد مگر قرآن وسنت کی روح کے زیر سایہ، روحِ عصر کو جرأت سے جواب اور حل بھی پیش کریں۔

اسلامی خاندان کے تعلق سے مولانا سلطان احمد اصلاحی (علی گڑھ) نے بعض اہم نظریات پیش کیے تھے۔ خاص طور پر 'مشترکہ خاندان' اور 'پردیس کی زندگی' سے متعلق ان کے خیالات اہمیت کے حامل تھے، لیکن ان خیالات پر بحث ومباحثہ کے بعد کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کی ضرورت ہے۔ 'خاندانی تشدد' کے مسئلے پر مولانا رضی الاسلام ندوی کی کاوش قابلِ ذکر ہے۔

عام فہم لٹریچر کی تیاری

خالص علمی اور فکری محاذ پر کام کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ ہم عام فہم عوامی لٹریچر (Popular Literature) کی تیاری پر بھی توجہ دیں۔ یہ فن آج کے مابعد جدید دور میں بہت ترقی کر چکا ہے۔ گہرے اور اُونچے مضامین بھی ہلکے پھلکے بیانیوں کے ذریعے بہت مؤثر طریقے سے پیش کیے جا رہے ہیں۔ فلسفے اور روحانیت پر اوشو رجنیش کی کتابیں، شخصیت کے موضوع پر ڈیل کارنیگی اور اسٹیفن کوئے کی کتابیں، معاشیات پر فرائڈ مین کی کتابیں وغیرہ ساری دنیا میں بڑے شوق کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ کتابوں کی کسی بھی دکان میں چلے جایئے، غیر افسانوی (non-fiction) کتابوں میں سب سے زیادہ مقبول اقسام درج ذیل ہیں:

۱۔ انتظامیات، کاروباری مطالعات اور شخصیت کو بہتر بنانے کی کتابیں، ۲۔ بچوں کی معلوماتی کتابیں، ۳۔ خانہ داری، تربیت اطفال، غذا اور صحت سے متعلق خواتین کی کتابیں۔

ہمارے یہاں پاپولرلٹریچر اور خاص طور پر ان تین اقسام (categories) پر کما حقہ کام نہیں ہوسکا۔ ان تینوں اقسام میں یہ زبردست صلاحیت موجود ہے کہ اقدار، اصول اور تصورات کو عوامی سطح پر ان کے ذریعے مقبول بنایا جاسکتا ہے۔ خواتین کے لٹریچر میں ایک زمانے میں ماہنامہ بتول لاہور نے اچھا کام کیا تھا۔ محترمہ حمیدہ بیگم، پروفیسر بنت الاسلام اور نیر بانو نے اس ضمن میں شان دار کام کیا تھا۔ لیکن ایک عرصے سے یہ محاذ خالی ہوتا جارہا ہے اور سطحی افسانوی ادب کے علَم بردار رسالوں اور ان کے اشاعتی اداروں نے اس محاذ پر قبضہ جما رکھا ہے۔ ہمارے حلقہ ہائے خواتین کو بھی اس مسئلے پر توجہ دینی چاہیے اور تحریک کو بحیثیت مجموعی اس پر متوجہ ہونا چاہیے۔

اسی طرح بچوں کے لٹریچر کی تیاری بہت پتّا ماری کا کام ہے۔ اب بچوں کا ذوق بہت بلند ہوچکا ہے۔ وہ صرف کہانیوں کی کتابیں نہیں پڑھتے، بلکہ چھے سات سال کے بچے بھی اُونچی معلوماتی کتابیں پڑھنے لگے ہیں۔ ان کی کتابوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ کاغذ کی قسم اور طباعت کے معیار کے اعتبار سے بھی اعلیٰ درجے کی ہوں اور معنوی خصوصیات کے اعتبار سے بھی مثالی۔ یاد رہے کہ مارکیٹ میں بچوں کے لیے کتابوں کی بڑی وسیع دنیا موجود ہے۔ مغربی تہذیب کے ساتھ اب اس محاذ پر عیسائی اور ہندو ادارے بھی خاصے سرگرم ہیں۔ کتابوں کی دکانوں پر ان کی پُرکشش اور دیدہ زیب کتابیں بچوں کو للچاتی ہیں۔ ہندستان میں ثانی اثنین خان کے ادارہ گڈ ورڈ پبلی کیشنز نے اور عالمی سطح پر عبدالملک مجاہد [پ: ۱۹۵۱ء] کی سربراہی میں ساؤنڈ وژن، شکاگو نے اچھی ابتدا کی، لیکن یہ ازحد ضروری ہے کہ تحریکاتِ اسلامی بھی اس پر بھرپور توجہ دیں۔ گذشتہ صدی کے پانچویں عشرے کے دوران مائل خیرآبادی، بنت الاسلام اور طالب الہاشمی وغیرہ نے اُردو میں، اور پھر ساتویں عشرے میں خرم مراد [۱۹۳۲ء-۱۹۹۶ء] نے انگریزی میں بچوں کے لیے لٹریچر تیار کرنے کی خاطر 'دی اسلامک فاؤنڈیشن'، برطانیہ میں بامعنی قدم اُٹھایا تھا، مگر بعد ازاں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوسکی۔ یاد رہے، بچوں کے لٹریچر میں تازگی کا احساس اور عصری حوالوں کا وجود ازحد ضروری ہے۔

(بقیہ صفحہ ۲۶ پر)

تعلیم و تربیت

پروفیسر محمد عاصم حفیظ[1]

نیا فیشن ۔ برقعے میں رقص

ہم اپنی درسگاہوں میں بچوں کی کیسی تربیت کر رہے ہیں؟

ملک کے سب سے بڑے نجی کالجز کے نیٹ ورک 'پنجاب گروپ' کے منڈی بہاؤالدین کیمپس نے طلباء کے لیے میوزیکل کنسرٹ منعقد کیا۔ تعلیمی اداروں اور خاص کر نجی تعلیمی اداروں میں میوزکل کنسرٹ کا انعقاد اب گویا نصاب کا لازمی جزو بن چکا ہے جس کے بغیر کورس مکمل ہی نہیں ہوتا۔ یہ سب اب معمول کا حصہ ہے، اس پر اب بات نہیں ہوتی کیونکہ یہ اب لازمی ہو چکا لیکن منڈی بہاؤالدین کیمپس نے کچھ خاص کرنے کا سوچا اور اپنے میوزیکل کنسرٹ میں رقص کے لیے برقعے کے استعمال کا فیصلہ کیا۔ جی ہاں ہمارے ہاں پردے و حجاب کی علامت سمجھے جانے والے برقعے کا یہ نیا استعمال ہے جو ایک تعلیمی ادارے نے متعارف کرایا ہے (سوشل میڈیا پر تصاویر ہر کہہ ومہ دیکھ رہا ہے)۔

دوسری جانب آج ہی عالمی میڈیا پر ایک خبر نشر ہوئی ہے کہ کینیڈا کی کچھ ریاستوں نے حجاب پر پابندی کے لیے قانون سازی کا عمل شروع کیا ہے۔ یورپ کے کئی ممالک پہلے ہی حجاب پر پابندی لگا چکے ہیں۔ یقین کریں مجھے تو اب مغربی ممالک کی حجاب کے خلاف مہم کچھ اتنی بری نہیں لگتی کیونکہ کم سے کم برقعے کو رقص کے لیے استعمال کرنے کا آئیڈیا ان کے ذہن میں بھی نہیں آیا۔ انہوں نے تو پہننے پر ہی پابندی لگا دی۔ ارض پاکستان میں ہر ایک کو اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے کی خوب آزادی ہے۔ کوئی قانون نہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں! نگرانی کا کوئی ادارہ نہیں! اور نہ ہی معاشرتی طور پر کوئی ایسی رکاوٹ ہے جو آپ کو اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے سے روک سکے۔ دوسری جانب اگر کوئی ادارہ ذرا سی بھی لباس کے حوالے سے ہدایت جاری کرے کرے مثلاً انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور اور کئی نجی اداروں نے صرف یہ نوٹیفکیشن جاری کیا کہ طالبات مناسب لباس زیب تن کیا کریں تو اس پر لبرل و مغرب زدہ طبقے نے اس قدر شور مچایا کہ چند گھنٹوں بعد ہی یہ نوٹیفکیشن واپس لینا پڑے۔ حتیٰ کہ خیبر پختونخواہ کے ایک

[1] asimmas27@gmail.com

ضلعی ایجوکیشن آفیسر نے سکول طالبات کو محض چادر اوڑھنے کی ہدایت جاری کی تو پورا دن الیکٹرانک اور سوشل میڈیا پر ایسا منظر پیش کیا گیا جیسے کوئی بہت بڑا سانحہ ہو گیا ہو۔ وزیر اعلی نے خود معذرت کی اور فوری طور پر وہ نوٹیفکیشن واپس لے لیا گیا۔

لیکن یہاں برقعے کی تضحیک اور پردے کا مذاق اڑانے اور اسے رقص کے لیے استعمال کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ اس پر کوئی ایکشن نہیں لے گا، اس پر کوئی میڈیا نہیں بولے گا، اس پر کسی آفیسر کی ناراضگی نہیں ہوگی اور اس پر کوئی آواز بلند نہیں ہوگی۔

جب درسگاہوں کو رقص گاہیں بنا دیا جائے اور طلبہ و طالبات کو ایسا ماحول فراہم کیا جائے تو پھر کون پردے کی بات کرے گا؟ کس کو برقعے کی فکر ہوگی اور کیوں کر کسی کو ضرورت ہوگی کہ وہ اسلامی شعائر کی تضحیک پر بات کر سکے؟

بلکہ آزادئ اظہار کے حق کو استعمال کر کے برقعہ پرایونجلز نامی کارٹون بھی بن سکتے ہیں۔ سرکاری اشتہارات میں داڑھی والے کو دہشت گرد بھی دکھایا جا سکتا ہے۔ فلموں میں مولوی کا کردار منفی بھی دکھایا جا سکتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص یا ادارہ غلطی سے بھی پردے کے اسلامی احکام کی بات کر دے، صرف لباس کو مہذب بنانے کی جسارت کر لے تو اس کے خلاف بھرپور مہم چلا کر اس کا جینا محال کر دیا جاتا ہے۔

’ترقی‘ کا یہ سفر اگر اسی طرح جاری رہا، نہ حکومت اس پر بولی اور نہ دینی قوتیں تو ممکن ہے اگلے سال آپ احرام میں بھی ڈانس دیکھیں۔ کون اسے روکے گا؟ کس کی جرأت ہے کہ اس پر بات کر سکے؟ یہی تو آزادی ہے جو تعلیمی اداروں کے ذریعے نوجوان نسل کو منتقل کی جا رہی ہے اور یہ سفر جاری ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

نماز میں دل کیوں نہیں لگتا؟

دل تو خرافات و تفریحات میں لگا ہوا ہے اور کہتے ہو کہ نماز میں دل نہیں لگتا۔ دل بدعات میں، منکرات میں، مکروہات میں اور فواحش میں لگا ہوا ہے اور کہتے ہو کہ نماز میں دل نہیں لگتا۔ اچھا تم ہی بتاؤ کہ دل آخر کہاں جائے؟ تم جدھر چاہو گے اُدھر ہی وہ جائے گا۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر طارق بٹ

دینی مدارس میں تجدد کہاں سے آ رہا ہے؟

مولانا زاہد الراشدی نے عمار ناصر کو اپنا جانشین مقرر کر کے اور دیوبند کے مولانا شکیب قاسمی نے مدرسہ ڈسکورس کی حمایت کر کے دیوبندیت میں تجدد کا جھنڈا گہرا گاڑ دیا ہے

۱۔ کسی دینی مدرسہ میں ایک طالب علم نے چوری کی۔ شکایت حضرت مہتمم صاحب تک پہنچی۔ انہوں نے انکوائری کرائی پتہ چلا نیا طالب علم ہے۔ آپ نے شکایت کنندہ سے کہا: میاں! ہمارے طالب علم نے چوری نہیں کی بلکہ ایک چور مدرسے میں گھس آیا ہے۔ ہم ان شاء اللہ اس کی اصلاح کر لیں گے۔

اسی طرح ہم یہ نہیں کہتے کہ دینی مدارس متجددین پیدا کر رہے ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ دینی مدارس کے بعض متخرجین کو متجددین نے اچک لیا ہے۔ اس کے سبب، ہمارے نزدیک، دو ہیں:

ایک تو یہ کہ مغربی استعمار اسلام اور مسلم دشمن ہے تو وہ دینی مدارس کا بھی دشمن ہے کہ مدارس اس کے غلبے کی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ وہ مغربیت کو قبول بھی نہیں کر رہے لہٰذا استعمار دینی مدارس کے خلاف کئی چالیں چل رہا ہے۔ حکومت کو لاکھوں ڈالر دیتا ہے کہ مدارس کا نصاب بدلو، اس میں جدید ملحدانہ، لبرل مغربی تعلیم داخل کرو، انہیں مرکزی تعلیمی دھارے میں لاؤ وغیرہ۔ وہ کئی پاکستانی این جی اوز کو فنڈنگ کر رہا ہے کہ دینی مدارس کی 'اصلاح' کرو۔ اب اس نے دینی مدارس کے متخرجین کے فکری اغوا کا 'مدرسہ ڈسکورس' کے نام سے ایک نیا پراجیکٹ لانچ کیا ہے تاکہ دینی مدارس کے ذہین متخرجین کی برین واشنگ کر کے انہیں قابو کیا جائے اور مستقبل میں ان کے ذریعے مدارس میں تجدد کے بیج بوئے جائیں اور ان میں فساد اور بگاڑ پیدا کر کے انہیں غیر مؤثر اور بدنام کیا جائے۔ پاکستان میں اس پروگرام کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عمار ناصر صاحب ہیں۔

دوسری وجہ مدارس کا علمی و فکری جمود ہے۔ ان کا نصاب اور ان کے متخرجین عصر حاضر سے Relevance نہیں رکھتے۔ وہ دین کو عصری ضرورتوں اور تقاضوں کے حوالے سے نہ سمجھتے ہیں اور نہ پیش کر سکتے ہیں۔ مدارس کے طلبہ کو جدید علوم اور مغربی فکر و تہذیب کا ابتدائی اور تعارفی مطالعہ کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا کہ اسے سمجھ سکیں چہ جائیکہ اس کا اعلیٰ علمی سطح پر ردّ

کر سکیں یا مغربی تہذیب کے مقابلے میں اسلامی تعلیمات کی برتری ثابت کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی ذہین اور شاطر آدمی مغربی فکر و تہذیب اور اس کے اہم تصورات اور اداروں کو موثر طریقے سے ان کے سامنے یہ کہہ کر پیش کرے کہ یہ مطابق اسلام ہیں تو وہ اس سے مرعوب و متاثر ہو جاتے ہیں۔

۲۔ حال ہی میں دو ایسے اقدامات سامنے آئے ہیں جن سے مدارس میں تجدد کو شہ ملنے کا خدشہ ہے۔ ایک تو یہ کہ مولانا زاہد الراشدی صاحب گو خود اکثر معاملات میں محتاط موقف اپناتے ہیں لیکن ساتھ ہی اپنے متجدد صاحبزادے (عمار ناصر) کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنا پرچہ (ماہنامہ الشریعہ) اور اپنا ادارہ (الشریعہ اکیڈمی) اس کے حوالے کر رکھا ہے اور وہ ان کے ذریعے دینی مدارس سلسلے کے طلبہ اور متفرغین کی تجدد کے حوالے سے برین واشنگ میں مصروف ہے۔ مولانا یہ کام عرصہ دراز سے، علماء کرام اور دوست احباب کے احتجاج کے باوجود، کر رہے تھے اور اب انہوں نے اس سلسلے میں ایک اور اہم قدم اٹھایا ہے کہ انہوں نے اپنے ہاں ایک خصوصی تقریب منعقد کی جس میں عمار ناصر کی صلاحیتوں اور سرگرمیوں کی خوب تعریف و توصیف کی اور پھر اسے اپنا جانشین مقرر کر دیا (دیکھیے تفصیل کے لیے ماہنامہ الشریعہ، شمارہ نومبر ۲۰۱۹ء مضمون ’الشریعہ اکادمی کے زیر اہتمام علمی و تحقیقی سرگرمیاں‘)۔

دوسرا یہ معاملہ کہ بھارت میں مدرسہ دیوبند (وقف) میں مولانا قاری محمد طیب مرحوم کے پڑپوتے مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی صاحب نے مدرسہ ڈسکورس کی حمایت کر دی ہے اور مدرسہ کے ایک متخرج وارث مظہری صاحب اس کے علمبردار اور محرک بن کر کھڑے ہو گئے ہیں (بلکہ اس کے کنٹری ڈائریکٹر ہیں)۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا کہ مدرسہ ڈسکورس مغربی استعمار کا ایک پراجیکٹ ہے جس کے ذریعے وہ دینی مدارس کے متخرجین کی برین واشنگ کر کے انہیں متجدد بنانا چاہتا ہے۔ جب بھارت میں دیوبند کے مولانا قاری محمد طیب مرحوم کے پڑپوتے اور پاکستان میں مولانا سرفراز صفدر مرحوم کے پوتے دینی مدارس میں تجدد پھیلانے کے منصوبے کے علمبردار بن کر کھڑے ہو گئے ہیں اور انہیں اندر سے حمایت بھی مل رہی ہے تو پھر ہم دیوبندی دینی مدارس کے لیے دعائے خیر نہ کریں تو اور کیا کریں؟ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دیوبندی مدارس کو تجدد کے شر سے محفوظ رکھے۔

۳۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس معاملے پر خاموشی یا درگزر کا رویہ مناسب نہیں بلکہ دیوبندی مدارس کے بڑوں کو اس معاملے پر مل بیٹھ کر غور کرنا چاہیے کہ ان کے مدارس میں تجدد کا راستہ کیسے

روکا جائے اور اس کے لیے کیا اقدامات کیے جائیں۔

۴۔ دینی مدارس کے وفاقوں میں سے ہر ایک کی قیادت سے اور ان کی متحدہ قیادت سے بھی ہم درخواست کریں گے کہ مغربی قوتوں، ان کی فنڈ ڈاین جی اوز اور ان کی ایماء پر پاکستانی حکمرانوں کی دینی مدارس میں مداخلت اور مدارس کے نظام ونصاب پر اثر انداز ہونے سے روکنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دینی مدارس کی قیادت خود اپنے نظام ونصاب پر نظر ثانی کرے، اپنی خامیاں دور کرنے کا سوچے اور ضروری تبدیلیاں کرنے سے نہ ہچکچائے۔ اور ہو سکے تو ہم جیسے خدام کی مودبانہ گزارشات بھی سن لے۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العلمین.

بقیہ: علماء، سکالرز، محققین اور اسلامی تحریکوں کو درپیش علمی چیلنج

مسابقت کی دوڑ، شہری زندگی کے تناؤ اور روحانی پیاس نے آج دنیا بھر میں اُس لٹریچر کو بہت مقبول بنایا ہے، جسے ذاتی بہتری (self improvement) کا لٹریچر کہا جاتا ہے۔ دل نشیں زبان اور پُرکشش پیرائے میں زندگی کی تنظیم کے اصول اور نظریات بیان کیے جاتے ہیں اور قصوں، تمثیلوں، لطائف وغیرہ کے ذریعے مشکل فلسفوں کو نہایت آسان کر دیا جاتا ہے۔ یہ کتابیں تھکے ماندے ذہنوں کے لیے تفریح بھی فراہم کرتی ہیں اور ان کی مصروف اور تناؤ سے پُر زندگیوں کی اُلجھنوں کو دُور کرنے کا کام کرتی ہیں۔

اسلامی علمی تاریخ میں سعدی شیرازی [۱۲۱۰ء۔ ۱۲۹۲ء] اور مولانا جلال الدین رومی [۱۲۰۷ء۔ ۱۲۷۳ء] نے اس فن کو انتہائی بلندی تک پہنچایا تھا۔ ماضی قریب میں گرو اوشور جنیش [۱۹۳۱ء۔ ۱۹۹۰ء] نے اسی طرزِ بیان کے ذریعے اپنے خیالات کو ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ آج ساری دنیا میں اس طرح کا لٹریچر مقبول ترین لٹریچر بن چکا ہے اور ہوائی جہازوں سے لے کر پارکوں اور دفتروں تک، ہر جگہ لوگ اس طرح کی کتابیں پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسلامی حلقوں میں عربی زبان میں اس طرح کی کتابوں کا رجحان شروع ہوا ہے، لیکن اُردو اور انگریزی میں اس پر توجہ ہونا ابھی بھی باقی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ ایمان اور دعوت، انصاف اور تہذیب، شرفِ انسانی کو پروان چڑھانے اور قرآن وسنت سے دنیا کو جوڑنے کے لیے یہ اُمور مرکزیت رکھنے کے باوجود، غالباً ثانوی درجے ہی میں کہیں دُور دکھائی دیتے ہیں، یا پھر سرے سے نگاہوں سے اوجھل۔

کیا اس صورت میں غالب اور حاکم تہذیب وتمدن کا جواب دینا ممکن ہے؟

فہم اسلام

محمد رضوان خالد چوہدری[1]

کیا خدا ہے؟ اور کیا اسی نے کائنات اور انسان کی تخلیق ایک منصوبہ بندی سے کی ہے؟

ایک ملحد پی ایچ ڈی سکالر سے مکالمہ

میرے استاد نے مجھے ایران سے آئی ایک سٹوڈنٹ سے بات کرنے کے لیے کہا جو علی الاعلان اسلام چھوڑ چکی تھی۔ میں نے اسے ڈاکٹر صاحب کا حوالہ دے کر ملنے کا وقت مانگا۔ ملاقات ہوئی اور جیسے ہی اسے پتہ چلا کہ بات اسلام سے متعلق ہے تو وہ کہنے لگی: میں اٹھائیس سال ایران میں اسلام دیکھ کر ہی یہاں آئی ہوں۔ اگر اسی اسلام کی بات کرنے آئے ہو تو اپنے اسلام سمیت یہاں سے چلے جاؤ۔ مَیں نے کہا نہیں! مَیں تو اس اسلام کی بات کرنے آیا ہوں جو قرآن بتاتا ہے۔ ایران اور سعودی عرب میں جو کچھ موجود ہے مَیں اسے اسلام کا چربہ سمجھتا ہوں۔ وہ یہ سن کر کچھ نرم پڑی لیکن کہنے لگی: میں نے تسلیم کر لیا ہے کہ میں کائنات میں اور کائنات خود ایک حادثے کے باعث موجود ہیں۔ مَیں نے کہا چلیے ہم یہ مان لیں گے لیکن کیوں نہ کائنات اور ہمارے نفس میں موجود ان نشانیوں کی بات کر لیں جن پر قرآن غور کرنے کو کہتا ہے۔ پھر اللہ نہ ملا تو تم اکیلی کیوں اسلام سے نکلو اکٹھے ہی چلیں گے۔ وہ مان گئی۔

میں نے اسے کہا تم نے کبھی سوچا قرآن میں اللہ یہ کیوں کہتا ہے کہ تم میری ایک بھی نعمت کا شمار نہیں کر سکتے۔ وہ بولی ایک نعمت کا شمار.... کتنی مضحکہ خیز بات ہے۔ ایک تو ایک ہی ہے ایک کا شمار کون کرتا ہے؟ میں نہیں جانتی تھی قرآن میں اتنی مزاحیہ باتیں بھی ہیں۔ مَیں بولا چلو ایک نعمت کا شمار کرتے ہیں۔

مَیں نے اس ملحد ایرانی لڑکی سے کہا، چلیے میں تھوڑی دیر کے لیے تمہاری بات مان لیتا ہُوں کہ کائنات کے اس خاص حصے یعنی زمین پر تمہاری موجودگی ایک حادثہ ہے۔ حادثے کی دین ہی سہی تم اس زندگی کو ایک نعمت تو مانتی ہونا؟ وہ کچھ کنفیوز ہوگئی اور بولی نعمت کہوں گی تو تم کہو گے یہ نعمت دینے والا بھی کوئی ہوگا، کیا تم یہی گھسی پٹی دلیل لے کر آئے ہو؟ مَیں نے کہا تم نتیجے

[1] rizwanhrm@gmail.com

پر چھلانگ کیوں لگاتی ہو؟ تم بھول گئیں کہ ہم تمہاری بات مان کر آگے بڑھ رہے ہیں کہ کائنات اور زندگی ایک حادثہ ہے. میرا سوال تو بہت سادہ ہے کیا تم اس بات پر خوش ہو کہ اس حادثے کے باعث تمہیں زندگی ملی؟ وہ بولی ہاں! یہ اتفاق حسین ہے۔ میں نے پھر پوچھا گویا زندگی کو تم بہرحال نعمت سمجھتی ہو۔ وہ کہنے لگی ہاں زندگی ایک نعمت تو ضرور ہے۔ میں اُس کے اس اقرار سے خوش ہوا اور کہا چلیے اب اِس نعمت کو شمار کرتے ہیں۔

وہ مسکرا کر کہنے لگی یعنی اب تم قرآن کی اس بات کی طرف آ رہے ہو کہ تم اللہ کی ایک نعمت کو بھی نہیں گِن سکتے۔ مَیں نے کہا کیا تمہیں خوشی نہیں ہوگی اگر تم اسے گِن کر قرآن کا دعویٰ جھوٹا ثابت کر دو اور تمہیں میری شکل میں ایک ایسا دوست مل جائے جو اسلام چھوڑ کر تمہارا ہم نوا ہو جائے؟ اُس نے مسکراتے ہُوئے کہا: چلو پھر گنتے ہیں اس نعمت کو۔ مَیں بولا زندگی ایک ایسی حقیقت ہے جسے دُنیا میں برقرار رہنے کے لیے کئی لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے جیسے آکسیجن، پودے اور پانی۔ کیا ہمیں زندگی کے ان لوازمات کو زندگی میں ہی شمار نہیں کرنا ہوگا؟ وہ بولی ہاں ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ان تین کے علاوہ دس ایسی چیزیں اور ہیں جو زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ یہ ہو گئے دس لوازمات اور یہ لو، گِن لی ایک نعمت۔ اب قرآن کے دعوے کا کیا کریں جو کہتا ہے کہ تم ایک نعمت نہیں گِن سکتے؟

میں نے کہا تم پھر نتیجے پر چھلانگ لگا رہی ہو۔ ابھی تو مجھے پانی کے بارے میں بات کرنی ہے اُس کے بعد سیکڑوں دوسرے لوازمات کے بارے میں جو میرے علم میں ہیں۔ وہ ہنس کر بولی یعنی ہماری بات اگلے کئی دن چلے گی۔ مَیں نے کہا کئی سال بھی مکالمہ جاری رہے تو کیا فرق پڑتا ہے؟ ہم اپنے یہاں موجود ہونے کی وجہ ہی تو ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ بولی چلو پھر پانی کی بات کرو۔

مَیں نے کہا ٹھیک ہے اب بیس منٹ مَیں بولتا جاؤں گا تم سنتی جانا۔ جو سوال ہو اپنے نوٹس میں لکھتی رہو آخر میں پُوچھنا۔ اُس نے سر ہلاتے ہُوئے اپنی نوٹ بُک کھول لی اور ایک صفحے پر بڑی سی ہیڈنگ 'مذہبی فضولیات' لکھ کر اُس ہیڈنگ کے نیچے لائن لگا دی۔ پھر مجھے اپنے لکھے کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تو جھینپ کر بولی میں شرمندہ ہوں لیکن مجھے فخر ہے کہ میں

بد دیانت نہیں ہوں جو دل میں ہوگا وہی کہوں گی۔ مَیں نے کہا شرمندگی کی کوئی ضرورت نہیں۔ دیانت ہی چاہیے۔ مجھے یقین ہے میری بات بھی تم اسی دیانت داری سے اپنے دل میں پراسس کروگی۔ وہ بولی یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ اب تم بیس منٹ بول سکتے ہو میں دخل انداز نہیں ہوں گی۔

مَیں نے بولنا شروع کیا۔ دیکھیے! زندگی جو ایک نعمت ہے، کے ہزاروں لاکھوں یا شاید کروڑوں لوازمات میں سے ایک اہم چیز پانی ہے۔ اب یہ تو سائنس بتا چکی کہ زمین جب بنی اس میں باہر سے جتنا پانی آیا تھا اس کے بعد سے نہیں آیا۔ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ پانی باہر سے ہی زمین پر آیا تھا۔ لیکن اس نکتے پر پھر بات کریں گے اسے اپنے نوٹس میں لکھ لو اور غور کرو جب حادثے سے دُنیا بن گئی اور مزید پانی بھی نہیں آیا تو پھر زمین پر پانی ختم کیوں نہیں ہوا؟ اس کی وجہ مبیّنہ حادثے سے ہی زمین کے گرد بننے والی وہ اوزون کی تہہ ہے جو نہ صرف سورج سے نکلنے والی مہلک ریڈی ایشن کو زمین پر پہنچ کر زندگی ختم کرنے سے روک لیتی ہے بلکہ اس پانی کو بھی ایک حد سے اوپر نہیں نکلنے دیتی جو سمندروں سے بھاپ بن کر بظاہر ضائع ہو جاتا ہے۔ اگر یہ اوزون کی تہہ نہ ہوتی تو زمین کا پانی ختم ہو جاتا۔

بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ جب یہ پانی جو کھارا اور پینے یا خشکی کے پودوں کے قابل نہ تھا اوپر جاتا ہے تو وہاں بجلیاں کڑکنے سے اس میں نائٹروجن بھی شامل ہو جاتی ہے جو پودوں کے لیے ضروری ہے اور بارش کے ذریعے نیچے آتے ہوئے اس کا کھارا پن بھی جاتا رہتا ہے۔ کیسا خوبصورت حادثہ تھا کہ اس نے ان باریکیوں کا بھی خیال رکھا.... ابھی بات ختم نہیں ہوئی۔ چونکہ پانی خشکی کا دو تہائی سے بھی زیادہ ہے اس لیے سمندروں سے بھاپ بن کر اُڑنے والا پانی اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اگر یہ سارا نیچے آ جائے تو زمین ڈوب جائے۔ حادثے نے اس بات کا بھی خیال رکھا کہ چند فیصد بھاپ بارش کی شکل میں بنجر زمین سیراب کیا کرے اور باقی بھاپ اوپر صاف ہو کر برف کی شکل میں نیچے آئے۔ اُس میں سے بھی کچھ پگھل جایا کرے باقی گلیشیئرز کی صورت میں محفوظ ہو جائے اور ان دنوں میں بھی آہستہ آہستہ پگھل کر زندگی کو فلٹرڈ پانی دیتی رہے جب بارشیں نہ ہوں۔ ذہن میں یہ سوال اٹھے گا کہ سمندر کا پانی کھارا ہی کیوں ہے؟ یہی صاف ہوتا تو زندگی کی حفاظت کے لیے باقی حادثوں کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ دیکھیے!

اگر سمندر کا پانی کھارا نہ ہوتا تو وہ آبی مخلوقات ہی نہ ہوتیں جو صرف کھارے پانی میں زندہ رہ سکتی ہیں اور اُن کی زندگی انسانوں سمیت زندگی کی دیگر شکلوں کے لیے بہت ضروری ہے۔

اب حادثے کا ایک اور کرشمہ دیکھیے کہ سمندر میں موجود زندگی کی حفاظت کے لیے حادثے پر حادثہ یہ ہوا کہ پانی جو زمین پر حادثاتی طور پر آیا تھا، کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ جمے تو نیچے کی بجائے اوپر آتا ہے۔ یعنی اوپر سے جو پانی برف کی شکل میں گلیشیئر زبن کر خشکی پر رہا وہ تو زندگی بچا ہی رہا ہے جو باقی برف سمندر پر گری وہ ڈوبنے یا نیچے جانے کی بجائے پانی کی سطح پر رہتی ہے۔ وہ سطح سردیوں میں موٹی ہو جاتی ہے اور سردیوں میں سردی نیچے پانی میں نہیں جانے دیتی جہاں وہ کروڑوں مخلوقات زندہ ہی نہ رہیں اگر باہر کی شدید سردی سے پانی ایک خاص حد سے زیادہ ٹھنڈا ہو جائے۔ کتنے کمال کے حادثے ہیں جو مسلسل ایک دوسرے سے مل کر کام کر رہے ہیں اور مزید کوئی ایسا نیا حادثہ بھی نہیں ہوا جو تسلسل سے ہونے والے حادثوں کا تسلسل اور وہ فریکوئنسی توڑ دے جو ہلکی سی بھی بدل جائے تو وہ زمین پر ہر قسمی کی زندگی کا آخری دن ہو۔ گویا حادثے میں ایسے کسی حادثے سے ہمیشہ کے لیے بچنے کا انتظام بھی حادثاتی طور پر موجود تھا تا کہ زمین پر حادثاتی طور پر پیدا ہونے والی زندگی کسی حادثے کے باعث ختم نہ ہو جائے۔

دیکھیے! یہ ساری کہانی آسمان کے ہماری زمین سے اُڑنے والے پانی کے واپس لوٹ آنے سے شروع ہوئی تھی اور جس دین کی بات میں تم سے کرنے آیا ہوں اُس کا بھیجنے والا قرآن میں کہہ رہا ہے کہ ہم نے جو آسمان بنایا اس کی یہ صفت رکھی کہ وہ واپس کرنے والا ہے۔ وہ جو آنکھیں بڑی کیے سُن رہی تھی بولی واؤ! یہ قرآن میں کہاں لکھا ہے؟ جب اُس ملحد لڑکی نے مجھے ٹوکا تو لگا جیسے میں اس منظر سے باہر نکل آیا ہوں جو اللہ کی ایک نعمت کا شمار کرتے ہُوئے میرے لاشعور میں چل رہا تھا۔

''یہی طے ہوا تھا نا کہ تم اپنے سوالات ''مذہبی فضولیات'' والی ہیڈنگ کے نیچے لکھتی رہو گی اور اپنی باری پر پوچھو گی'' مَیں نے اُس سے پُوچھا تو وہ بولی: سوری رہا نہیں گیا، یہ بہت سرپرائزنگ ہے کہ قرآن نے تمہارے بقول آسمان کو لوٹانے والا کہا ہے اور ہماری ڈسکشن

سے یہ تو واضح ہے کہ اوزون میں پانی لوٹانے والی صفت نہ ہوتی تو زمین پر زندگی پیدا ہی نہ ہو سکتی۔ تبھی مجھے تجسس ہوا کہ دیکھوں قرآن میں آسمان کے لوٹانے کی خصوصیت کا کہاں ذکر ہے؟

مَیں نے اُسے سُورۃ الطارق کی گیارھویں آیت دکھائی، قرآن کے تراجم عمُوماً الرَّجْعِ کا سادہ سا مطلب کرتے ہیں۔ میں نے اُسے قرآن کی ٦ الگ الگ تفاسیر اور لغت دکھائی تو وہ کہنے لگی ہاں ٹھیک ہے ابھی تک تم اپنا کیس ٹھیک پیش کرر ہے ہو۔ آگے دیکھتے ہیں۔

مَیں بولا لیکن تم اب سوال لکھتی رہوگی اور اپنی باری آنے پر پُوچھوگی۔ اُس نے ہاں میں سر ہلایا تو میں اپنی بات جاری رکھتے ہُوئے بولا: مَیں تمہیں پانی اور خشکی کا وہ تناسب بھی قرآن میں دکھا سکتا ہوں جو اس وقت زمین پر موجود ہے۔ چاہو تو اس نکتے کا اپنے نوٹس میں اضافہ کر لو۔ ہم پانی پر مزید بات کر سکتے ہیں لیکن اب تم نے ردھم توڑ ہی دیا ہے تو کیوں نہ ہم اس حادثے کی طرف چلیں جس نے یہ دنیا تشکیل دی تھی۔

وہ بولی ویسے تو میں اپنے بارے میں جاننا چاہتی ہوں کہ میں یہاں کیوں ہوں؟ لیکن تم پیچھے جانا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن پہلے مجھے اس آیت کے لفظ کی تشریح کی تصویریں لینے دو۔ وہ تصویریں لینے لگی تو میں نے پُوچھا یہ بتاؤ تمہارا فون کیا جدید ترین ہے؟ وہ بولی چند مہینے پُرانا ہے لیکن جدید ترین کے قریب ہے۔ اس کا کیمرا کتنے میگا پکسلز کا ہے؟ مَیں نے پُوچھا۔ وہ بولی شاید بارہ میگا پکسلز کا ہے۔ میں بولا کیا تم جانتی ہو جو حادثہ تمہاری اور تم جیسے اربوں انسانوں کی تخلیق کا باعث بنا وہ اتنا شاندار تھا کہ اُس نے تمہاری آنکھوں میں ۵۷٦ میگا پکسلز کے دو کیمرے نصب کر دیے ہیں۔ یہ کیمرے جو تصویریں کھینچ کر تمہارے دماغ کو بھیجتے ہیں وہ اتنے وقت میں ان تصویروں میں موجود (۱،۰۷،۰۰،۰۰۰) ایک کروڑ سات لاکھ رنگ اور دیگر چیزیں شناخت کر سکتا ہے جو ایک سیکنڈ سے بھی اتنا کم ہے کہ ہم اُسے ماپ نہیں سکتے۔

اس حادثے سے صرف یہی نہیں ہوا بلکہ اس حادثے نے تمہارے جسم میں بارہ ایسے پیچیدہ ترین نظام تشکیل دیے جن کی تمام جزئیات ہم ابھی تک نہیں جان پائے ہیں اور حادثاتی طور پر یہ سب نظام مل کر کام کرتے ہیں تاکہ تمہاری زندگی برقرار رہے۔ لیکن ہم تمہاری بات

بعد میں کریں گے پہلے ابتدائی حادثے کی طرف چلتے ہیں۔

اس کی سوچتی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اُس کی خود سے جنگ جاری ہے۔ ہوں ہاں کیے بغیر وہ میری طرف دیکھتی رہی۔ مَیں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، کیا سائنس معلُوم کر چکی کہ کائنات کی لمبائی چوڑائی کتنی ہے؟ وہ بولی یہ ممکن نہیں ہے۔

مَیں نے کہا مَیں جانتا ہوں۔ کیوں کہ سائنس اب کہتی ہے کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے۔قرآن نے چودہ سو سال پہلے یہی کہا تھا، نوٹ کر لو میں ریفرنس دوں گا۔ بائبل سمیت ساری دنیا پچھلی صدی تک سُورج کے ساکن ہونے کو یُونیورسل ٹروتھ کہتی تھی قرآن نے چودہ سو سال پہلے کہا تھا کہ سبھی ستارے سیارے اپنے لیے طے کردہ مداروں میں گھوم رہے ہیں۔ اب یہ بات کامن سینس کی ہے لیکن چودہ صدیوں پہلے کی دُنیا میں تصور کرو ایسا کون سوچ سکتا تھا۔ میں نے دیکھا وہ اپنے سوالات لکھ رہی ہے۔

مَیں نے کہا تم مانتی ہو چودہ ارب سال پہلے ایک دھماکے کے ذریعے یہ کائنات بنی تھی۔ مَیں یہ پُوچھوں گا ہی نہیں کہ جس نے ڈھائی سو ارب سے زیادہ کہکشائیں تشکیل دیں وہ دھماکہ ہوا کس چیز میں تھا؟ دھماکے سے پہلے کیا تھا؟ کیا یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور آخری دھماکہ تھا یا ایسے حادثے کہیں اور بھی ہوئے؟ میں پُوچھ بھی لوں تو کیسے جواب دو گی کیونکہ سائنس تو ابھی یہ سب جانتی ہی نہیں۔ مَیں تو اس حادثے کی خوبصورتی کی طرف تمہیں متوجہ کرنا چاہتا ہوں دیکھو خود بخود ہونے والے اس حادثے کے نتیجے میں کھربوں سورج بنے۔ ہر سورج کے ساتھ بہت سی زمینیں بنیں۔ پھر حادثے ہی کی بنیاد پر ہماری بھی ایک زمین بنی اور حادثاتی طور پر ہی سورج کے گرد اور اپنے محور کے گرد گھومنے لگی اور گھومی بھی 23.5 ڈگری جھکاؤ پر جو اگر آدھا ڈگری بھی کم یا زیادہ ہوتا تو زمین پر زندگی نہ ہوتی۔

لیکن مان لیا ہو گیا اتفاق۔ پھر ایک اور اتفاق یہ بھی ہوا کہ یہ زمین اپنے محور کے گرد (چار سو ساٹھ)۴۶۰ میٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے اور سورج کے گرد ۱۱۰،۰۰۰ (ایک لاکھ دس ہزار) کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومنے لگی۔ اگر ان دونوں سپیڈز میں چند کلومیٹر فی گھنٹہ کا بھی فرق ہوتا تو زمین پر نہ کوئی درخت اُگ سکتا نہ کشش ثقل موجودہ تناسب میں ہوتی۔ انسانی اور

نباتاتی زندگی کو مُمکن بنانے کے لیے زمین کے گھومنے کی رفتار بالکل یہی ہونی چاہیے تھی جو ہے۔کیا تم ان اتفاقات در اتفاقات پر حیران نہیں ہو؟

وہ بالکل خاموش تھی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہُوئے کہا کیا تم جانتی ہو کہ اگر زمین کے جھکاؤ کا زاویہ آدھا ڈگری بھی کم یا زیادہ ہوتا تو زمین پر موسم نہ بدلتا یعنی زندگی نہ ہوتی۔کیا تم اندازہ کرسکتی ہو کہ زندگی جسے تم ایک نعمت مان چکی ہو، کی تشکیل اور حفاظت کے لیے بقول تمہارے اس خود کار حادثے نے کتنے پاپڑ بیلے ہیں؟

مَیں نے اُس کی آنکھوں میں نمی دیکھی تو کہا یہ پانی جو تمہاری آنکھوں سے چھلکنے کو ہے اس پر بھی بات کریں گے کہ ان آنسوؤں کے نظام کو اس حادثے نے زندگی کی کس مدد کے لیے تمہارے جسم میں تشکیل دیا لیکن پہلے اپنے فون میں کیلکو لیٹر نکالو تاکہ میں تمہیں دکھا سکوں کہ قرآن نے زمین پر پانی اور خشکی کا وہ تناسب کتنا ایگزیکٹ بتایا ہے جو سائنس نے آج معلوم کیا۔اُس نے ایک لفظ بولے بغیر فون میں کیلکو لیٹر کی ایپ کھولی اور میری طرف دیکھنے لگی۔

مَیں اُس کے چہرے کے تأثرات سے جان سکتا تھا کہ وہ اللہ پر ایمان لے آئی ہے لیکن مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ میرا مقصد مسلمانوں کی تعداد میں ایک اور مسلمان کا اضافہ کبھی رہا ہی نہیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ نبوت میرے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہو چکی، وہ اللہ کا پیغام مکمل کر کے عمل میں ڈھال کر تو دکھا گئے لیکن اپنی عصری اور انسانی مجبوریوں کے باعث دُنیا کے ہر خطے اور ہر دور کے افراد تک خود چل کر وہ پیغام نہیں لے جا سکتے تھے۔میرے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یقین تھا کہ ہر دور وہ سابقون ضرور ڈھونڈ لے گا جو ان کے نمائندے بن کر ان کا پیغام آگے مزید آگے پہنچائیں گے۔

میں نے جتنے مرد و خواتین کو بھی اسلام میں داخل کیا یہی سوچ کر کیا کہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ نمائندگی کریں گے جو پیدائشی مسلمان فرقوں کی لڑائی میں اُلجھ کر بھلا بیٹھے ہیں۔اس کے لیے ضروری ہے کہ اسلام میں نئے داخل ہونے والے حق الیقین، جوش و جذبے اور شکر کا مرکب بن کر اسلام میں داخل ہوں۔یعنی اسے کلمہ پڑھانے سے پہلے مجھے مزید دلائل کے انبار لگانے ہوں گے۔ایمان کنوِکشن کے ساتھ نہ ہو تو ابوبکرؓ، عُمرؓ، عثمانؓ، علیؓ اور عائشہؓ اور

فاطمہؓ جیسے مسلمان پیدا نہ ہوں گے، وہ نہ ہوئے تو ختم نبوّت کی عملی دلیل کون بنے گا؟

وہ بولی: میں مانتی ہوں تم یہ نے یہ ثابت کر دیا کہ کائنات کا بننا حادثہ نہیں تھا، اسے واقعی کسی خدا نے ہی بنایا تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ثابت کرو گے کہ قرآن تمہارے بیان کردہ اللہ نے ہی بقول تمہارے مکہ میں پیدا ہوئے ایک شخص پر نازل کیا تھا۔ مَیں نے کہا بس یہی ثابت کرنے میں دیر لگتی ہے جو تم نے مان لیا۔ اس حقیقت کو کہ قرآن اللہ کا کلام ہے میں ایک منٹ میں ایک معمولی مکھی سے ثابت کر دوں گا۔

وہ زور سے ہنس پڑی اور بولی ہاں! پہلے دن تم مجھے بالکل پاگل لگے تھے۔ شکل سے بھی لگتے ہو لیکن اب مجھے شک نہیں کہ تم ایسا کر سکتے ہو لیکن میں سننا چاہتی ہوں۔ مَیں نے پوچھا یہ بتاؤ تمہاری سائنس نے کب ثابت کیا ہے کہ شہد بنانے کا سامان مادہ مکھی جمع کر کے لاتی ہے نر مکھی نہیں؟ وہ اپنے فون پر گوگل سے یہ معلومات تلاش کرنے لگی اور تھوڑی دیر بعد اس سلسلے میں ایک تحقیق میرے سامنے رکھ دی جو اس کی تفصیل بتاتی تھی۔

مَیں نے فون اس سے لیے بغیر کہا: مجھے اس میں دلچسپی نہیں۔ تم بس یہ بتاؤ کہ جو بات سائنٹیفک ریسرچ نے اب جانی ہے قرآن نے وہ چودہ سو سال پہلے کیسے کہہ دی کہ اللہ نے شہد کی مادہ مکھی کو شہد بنانے کا طریقہ وحی کیا۔ اب میرے سوال کا جواب دو چودہ صدیوں پہلے یہ حقیقت کون جان سکتا تھا کہ شہد نر نہیں مادہ مکھی بناتی ہے۔ وہ پی ایچ ڈی سٹوڈنٹ تھی، دلیل ہی ریسرچ سٹوڈنٹ کا اوڑھنا بچھونا ہوتی ہے۔ بغیر ہچکچائے بولی۔۔ گاڈ۔

پھر بولی دکھاؤ مادہ مکھی کہاں لکھا ہے قرآن میں۔

میں نے اسے فَاسْلُکِی کا لفظ دکھایا وہ اس لفظ کی گوگل سے تشریح دیکھتی رہی پھر بولی ہاں یہی مطلب ہے۔

مغرب کا وقت تھا مَیں نے کہا چلو مسجد چلتے ہیں۔ وہ بولی ہاں، ایک لمحہ ضائع کیے بغیر۔ مَیں نے کال کر کے ان پروفیسر صاحب کو بھی مسجد آنے کے لیے کہہ دیا جنہوں نے مجھے اس لڑکی سے ملنے کا کہا تھا کہ تا کہ وہ بھی اس کے تجدید ایمان کا منظر دیکھ سکیں۔

فہم اسلام/ڈائیلاگ پروفیسر قاضی محمد ظفرالحق [۱]

قرآن وسنت کی سیاسی تعلیمات کی رو سے عصر حاضر میں دینی عناصر کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟

اقتدار یا اصلاح اِقتدار

مدیر البرہان کے ایک مضمون پر نقد

[پروفیسر قاضی محمد ظفرالحق صاحب کے اٹھائے گئے مباحث کے بارے میں مدیر البرہان کا جواب اگلے شمارے میں ملاحظہ کیجیے]۔

محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب تعلیم اور اصلاحِ مدارس کے حوالہ سے کام کرنے والے خادمانِ دین میں ایک نمایاں شخصیت اور ملت کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ملی مجلس شرعی کے روحِ رواں ہونے کی سعادت بھی ایک بڑی سعادت ہے جو ان کے حصہ میں آئی ہے۔مزید برآں یہ کہ ’’البرہان‘‘ نامی ایک گراں قدر ماہنامہ اُن کی زیر ادارت باقاعدگی سے شائع ہوتا اور سیکولرازم پر تنقید اور اسلام دشمن قوتوں کے پول کھولنے میں لائق قدر خدمت سرانجام دیتا ہے۔

جناب ڈاکٹر محمد امین صاحب کے پسندیدہ موضوعات میں سے ایک دینی سیاسی جماعتوں کا لائحہ عمل اور اُن کو مفید مشورے اور تجاویز دینا بھی ہے۔ یہ موضوع اپنی نزاکت واہمیت کے اعتبار سے جس قدر حساس ہے اُسی قدر متنازعہ بھی ہے۔پچھلی تین دہائیوں سے دینی حلقوں کے لیے ’’مشترکہ لائحہ عمل اور متفقہ قیادت‘‘ کے حصول کی خاطر اس عاجز نے بھی تحقیق ومطالعہ اور غور وفکر کی طویل سرگردانی کے علاوہ عملی جدوجہد کا ایک لمبا سفر طے کیا ہے۔اس وجہ سے جب کوئی اس موضوع پر لکھتا یا بولتا ہے تو قدرتی طور پر میری توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔اس حوالہ سے ماہنامہ ’’البرہان‘‘ میں جو کچھ چھپتا ہے مَیں اُسے بھی بغور پڑھتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔اس بار ماہ ستمبر کے شمارہ میں جناب ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اُس کا خلاصہ مضمون کے آخر میں خود انہوں نے درج فرما دیا ہے۔اس لیے بات کو مزید آگے لے جانے سے پہلے میں چاہوں گا کہ قارئین کرام اس خلاصہ پر ایک نظر ڈال لیں تاکہ عاجز کی معروضات کا سمجھنا اُن کے لیے آسان ہوجائے۔ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

---

[۱] چیئرمین علمی وتحقیقاتی کمیشن، ملی یکجہتی کونسل، واہ

''پاکستان میں ۷۲ سال تک جمہوری جدوجہد کر کے یہاں کی دینی سیاسی جماعتیں آج جس حالت زار میں ہیں اوران کا جو ووٹ بنک ہے، ان کے اسمبلیوں میں جتنی نشستیں لینے کا امکان ہے، ان کے پیش نظر کوئی عقل کا اندھا ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ جماعتیں پاکستان میں برسراقتدار آسکتی ہیں اور ان کے ذریعے غلبۂ اسلام ممکن ہے۔ غیر جانبدارانہ رائے یہی ہے کہ اس کا ایک فیصد بھی امکان نہیں۔ تو کیوں نہیں ہماری دینی قوتیں اور ہمارے علماء کرام اس منہج کی طرف لوٹ جاتے جس پر ان کے اسلاف ۱۳ سو سال تک عمل پیرا رہے ہیں کہ مسلم حکمرانوں کی پرامن طریقے سے اصلاح کی کوششیں کی جائیں اوران کا حریف بن کران سے کشمکش کا طریقہ چھوڑ دیا جائے۔''

اس گفتگو کے بعد دعوت واصلاح، تعلیم وتربیت اور تزکیۂ نفس کے حوالہ سے اس مضمون میں اور دیگر مقامات پر بھی فرد اور معاشرہ کے لیے ان مبارک کاموں کے بارے میں جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اُس سے اس عاجز کو مکمل اتفاق ہے۔ ان کے اس مضمون میں بھی اوران کی مجموعی فکر میں بھی میرے نزدیک محل نظر وہ نقطۂ ہے جسے وہ ''اقتدار نہیں اصلاحِ اقتدار'' کا عنوان دیتے ہیں اور جس کے لیے ان کے رشحات قلم کا شمار کرنا مشکل ہے۔

محترم ڈاکٹر امین صاحب خود ایک دینی سیاسی جماعت کے رکن رہے ہیں اور اس حوالہ سے دینی سیاسی جماعتوں کی الیکشن میں ناکامی کے غم میں برابر کے شریک ہیں لیکن خاکسار کی رائے یہ ہے کہ وہ ایک ایسی غلطی کا شکار ہو گئے ہیں جو ردّعمل کی نفسیات سے جنم لیتی ہے۔ ردّ عمل کی نفسیات ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری ٹھوکر کا باعث بنتی ہے تا آنکہ فرد خود کو سنبھال کر اس غم وغصہ سے نجات پا جائے اور پھر تجزیہ، تحلیل، تفکر اور تحقیقِ مزید کے عمل سے نئے سرے سے گزر نہ جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مبحث کو گہرے تجزیہ اور تنقیح کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں عاجز کی طرف سے غور وفکر اور مزید تحقیق حق کی خاطر چند گزارشات پیش خدمت ہیں:

محترم ڈاکٹر صاحب کی تجویز کے دو حصے ہیں ایک یہ کہ دینی سیاسی جماعتیں الیکشن میں حصہ لے کر اہل اقتدار سے جو کشمکش کرتی ہیں، اُسے ترک کر دیں۔ دوسرے یہ کہ انہیں اسلامی ریاست یا صحیح تر الفاظ میں خلافت کے قیام کے لیے اپنی اصلاح وارشاد اور تعلیم وتربیت اور

تزکیۂ نفس کی محنت کا ہدف حکمرانوں کو بنانا چاہیے اور اس کے لیے اپنے خلوص و محبت کا حکمرانوں سے رشتہ جوڑنا چاہیے جو آنجناب کے نزدیک ۱۳ سو برس سے صالحین اُمت، اولیاء وعلماء کا طرزِ عمل رہا ہے۔

اس عاجز کے نزدیک ’’دورِ حاضر کے اسلام پسند طبقات کی فکری و عملی الجھنوں کا اصل سبب ریاست جدید کی فطرت وطبیعت کا تجزیہ کرنے میں ناکامی ہے‘‘ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی تحریر سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اصل چیلنج کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے ماضی کے سہانے خوابوں اور یادوں میں کھو گئے ہیں۔

بایں وجہ خاکسار اپنی گفتگو کو تین حصوں میں تقسیم کرنا مناسب سمجھتا ہے۔ اولاً ماضی اور حال کی ریاستوں کا فرق، ثانیاً انتخابات میں اصل قوت سے کشاکش نہ ہونا اور ثالثاً دینی سیاسی جماعتوں کا میدانِ انتخابات میں موجود رہنا کتنا مفید ہے اور کتنا مضر۔ آخر میں اسلامی ریاست کے قیام کے واحد آزمودہ جدید طریق کار کے بارے میں چند معروضات عرض کروں گا:

پہلے زمانہ میں ریاست بادشاہ کی ذات میں مرتکز ہوتی تھی۔ اس لیے حکومت، ریاست اور حکمران گروہ کا مرکز ایک ہی ہستی ہوتی اور ایسا مسلم اور غیر مسلم دنیا میں یکساں طور پر رائج تھا۔ اس وجہ سے حکمران یا اُس کے قریبی طاقتور امراء پر اصلاح وارشاد کی محنت کامیاب ہوتے ہی ساری سلطنت وحکومت میں تبدیلی کی لہر چل پڑتی تھی۔ جیسا کہ قسطنطین کی تبدیلی سے روم میں ہوا اور جہانگیر کی تبدیلی سے اسلامی ہند میں ہوا کہ دین الٰہی کو دربارِ مغلیہ سے بیک بینی ودو گوش پکڑ کر رخصت کر دیا گیا۔ ریاست حکومت اور حکمران گروہ کی ساری قوت کا مرکز ایک ہی شخص کے ہونے کی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے والا ناموں میں بادشاہوں کو اس بات سے آگاہ فرمایا تھا کہ تمہارے انکار کے باعث تمہاری رعایا کے کفر کا وبال بھی تم پر ہی آئے گا۔

بادشاہت کے خلاف یورپ میں جب جمہوری انقلاب کا آغاز ہوا تو اس انقلاب نے بے شمار فکری واعتقادی تبدیلیاں بھی جنم دیں۔ سب سے پہلے وفاداری کے مرکز یعنی بادشاہ اور خاندان کو ختم کر کے، وفاداری کے لیے ایک نئے مرکز کو تلاشا گیا اور اُس کو نام دیا گیا ’’قومی وطن (Nation State) کا۔ اب وطن ایک خاص قوم کا علاقہ اور اُس پر حکومت اُس قوم کا

مسلمہ حق اور اس قوم کے ہر فرد کا اس معبودِ وطن سے عہد وفا پہلی جمہوری قدر کے طور پر تسلیم کرلیا گیا۔

دوسری قدر عوام کی سلاطین کے ظلم و جبر سے آزادی اور حکمرانی میں شرکت کا حق ٹھہری۔ اس کے نتیجہ میں عوامی نمائندگان پر مبنی مجلس قانون سازی وجود میں آئی اور ہر سطح پر سوال اور احتساب، عام آدمی کا حق اور جوابدہی عوامی نمائندگان کا فرض قرار پایا۔

جمہوری ریاستوں کو جنم دینے والے عوامی انقلاب کے مفکرین یہ بات خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ اقتدار کی ساری قوت اور کل اختیارات کے ایک جگہ جمع ہو جانے کے بعد عوام کو غلام بنا لینے کی فرعونی فطرت حکمرانوں میں لازماً عود کر آتی ہے چنانچہ انہوں نے ریاست جدید کی طاقت تین بڑے اداروں میں تقسیم کر کے ان کے سربراہان کو بھی اصول وضوابط کا پابند کر دیا اور انہیں اپنے اختیارات کو مطلق العنانی سے اور مَن مانی کرتے ہوئے استعمال کرنے سے روک دیا۔ یہ تین ادارے ہیں، پالیمنٹ (مقننہ) جو آئین اور قانون بناتی ہے، عدلیہ جو قانون پر فیصلے دیتی اور آئین وقانون کی تشریح کرتی ہے اور انتظامیہ جو قانون نافذ کرتی اور ریاستی امور کی نگہبانی کرتی ہے۔ آج کسی ایک شخص یا اشخاص کے بدل جانے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیونکہ ہر سیٹ قواعد وضوابط کی پابندی اور ہر ادارہ انسانوں کے مرتب کردہ اصول وقوانین کا پابند ہے۔ اس وجہ سے اگر آپ کسی حکمران کو اسلام کا گرویدہ بنا بھی لیں تو یہ ممکن نہیں ہے کہ ریاست جدید میں وہ کوئی جوہری تبدیلی برپا کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

مزید برآں یہ کہ دورِ جدید کی ریاست نہایت تندہی سے اس کوشش میں مصروف ہے کہ اپنی طبیعت ومزاج سے اختلاف رکھنے والے اُن تمام معاشروں کو فنا کر دے جو کسی وقت اُس کے لیے تبدیلی کا خطرہ پیدا کر سکتے ہیں۔ اس ہدف کے حصول کے لیے وہ اپنی قاہرانہ قوت رکھنے والے اداروں، میڈیا اور نت نئی قانون سازی کے ہتھیاروں سے بے رحمانہ حملے کر رہی ہے۔

آپ کی تجویز ''اقتدار نہیں اصلاحِ اقتدار'' اُمت مسلمہ کے ماضی میں کامیابی سے آزمائی جانے والی ایک تدبیر رہی ہے۔ گوالیار کے قلعہ میں جہانگیر کو لا کر حضرت مجدد الف ثانیؒ

کے قدموں میں ڈالنے والے جرنیل نے عرض کیا کہ حضرت آج سے حکومت ہند آپ کو مبارک ہو، فرمایا کہ نہیں بلکہ حکومت جہانگیر کو واپس کردو اور اس سے یہ عہد لے لو کہ آج کے بعد دین الٰہی کی نہیں بلکہ دین اسلام کی پیروی کی جائے گی۔ اس بے نفسی نے جہانگیر کی دنیا بدل ڈالی اور پھر اُسی تخت پر اورنگزیب جیسا مجاہد و غازی صوفی و عالم اور حافظِ قرآن شہزادہ بھی جلوہ افروز ہوا۔

بادشاہوں اور خلفاء کی اصلاح اور ان کے اندر خلفائے راشدین کی طرز پر چلنے کی خواہش کے پیچھے جو بار بار ظہور پذیر ہوتی رہی، ہمیشہ ایسے ہی بے نفس مصلحین کا ہاتھ رہا ہے اور دعوت و اصلاح کے اس عمل کی افادیت سے انکار آج بھی نہیں ہے۔ تاہم بادشاہوں کے ریاست، حکومت اور حکمران گروہ کا مرکز ہونے کی وجہ سے یہ عمل ماضی میں جتنا کامیاب تھا آج اس کی کامیابی اتنی ہی ناممکن ہے کیونکہ آج کا بادشاہ ریاست کے ادارے ہیں نہ کہ صدر یا وزیر اعظم۔ نیز ماضی میں کوئی بھی ریاست، اسلامی ریاست کے سوا، کسی نظریہ پر نہیں بلکہ قومی یا قبائلی عصبیت پر بنتی تھی جبکہ آج کی سیکولر جمہوری ریاستیں انسانی حاکمیت کے جس عقیدہ کفر پر قائم ہوئی ہیں اُس کے بارے میں نہایت حساس ہیں اور ہر کفر کی طرح انہیں بھی یہ علم ہے کہ ہمارا اصل دشمن دیگر نظریات یا فکر نہیں بلکہ اسلام ہی ہے لہٰذا وہ ایک مجموعی ردّعمل کے ذریعے جو ہر ادارے کی طرف سے آتا ہے کسی بھی اسلامی اصلاح کو ردّ اور ضائع کرنے میں دیر نہیں کرتیں۔

اس تجویز میں اس نہایت اہم پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ ماضی کی مسلم حکومتوں، اداروں، معاشرہ اور حکومت و ریاست کو درست کرنے کی خواہش رکھنے والے مصلحین کے درمیان اسلام اور دہریت، ایمان اور فکر، فلسفہ اور عقیدہ کی ہر سطح پر کشمکش موجود نہیں تھی۔ اس وجہ سے اسلامی ریاست اور اس کے اداروں میں کمزوری زیادہ تر عملی پہلو سے آتی تھی جس کی تسلیم شدہ عقائد کی بنیاد پر یاددہانی اور نصیحت سے اصلاح ممکن ہوتی تھی جبکہ آج خود اسلام معرضِ پیکار بن چکا ہے۔

آج اگر صدر یا وزیر اعظم یا دیگر عنوان رکھنے والے کسی عہدیدار یا حکمران کی نصیحت و فہمائش سے اصلاح ہو بھی جائے تو اس کے نیچے موجود عقیدہ کفر پر قائم ریاست اور اس کے

ادارے اس اصلاح کو قبول کرنے کے لیے محض یہ کہ تیار نہیں ہیں بلکہ وہ اس اصلاح اور اصلاح یافتہ حکمران کو سَر سے اُتار پھینکنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ ریاستی ادارے، مغربی ذہن رکھنے والی مؤثر عمل پذیر قوتیں اور ایک معتد بہ تعداد میں انگریزی تعلیم یافتہ عوام کی وہ تعداد جو اسلام سے بیزار اور کفر مغرب کی حامی ہے اس سارے عملِ اصلاح کے شدید دشمن ہیں۔

اس حوالہ سے یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ کیا پاکستان اور دیگر مسلم ممالک کے تمام دینی عناصر الیکشن لڑ رہے ہیں؟ واضح رہے کہ نہیں۔ تو آپ دینی عناصر کو انتخابی میدان سے خارج ہو جانے کی وہ دعوت کیوں دے رہے ہیں جس کی خواہش اور کوشش تمام سیکولر عناصر کی طرف سے بھی پیہم جاری ہے۔ آپ خود اور وہ تمام دینی حلقے جو انتخابات میں شریک نہیں ہوتے آخر یہ فرض منصبی خود کیوں نہیں سنبھال لیتے کہ حکمرانوں کو اسلامی ریاست کے قیام پر آمادہ کریں۔ آپ کی تو اُن سے کوئی کشمکش نہیں ہے۔

فرد اور معاشرہ کی اصلاح کی ذمہ داری مسجد، مدرسہ، خانقاہ اور دیگر اصلاحی اسلامی اداروں پر ڈالی گئی ہے اور اس کارِ عظیم میں دینی سیاسی جماعتیں اُن کی معاون و مددگار بھی ہیں اور محافظ و سائبان بھی۔

موجودہ ریاستی نظام میں ہونے والے الیکشن اصل مقتدر قوت کے ساتھ کشمکش کا میدان بھی نہیں ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا کہ بادشاہ کی قوت کو تین اداروں کے مابین تقسیم کر کے ریاست کی طبیعت و فطرت کو ایک طرح کا پائیدار تحفظ دیا گیا ہے۔ ان تین اداروں میں سے اصل ادارہ جو عملاً حکومت کرتا ہے وہ تو انتظامیہ ہے اور انتظامیہ الیکشن سے نہیں بلکہ ملازمت سے وجود میں آتی ہے۔ اس انتظامیہ کو عمل کے اصول و ضوابط اور حکمتِ عملی مقننہ مرتب کر کے دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقننہ میں موجود ایک شخص بھی وہ کام کر گزرتا ہے جو باہر بیٹھے ہزاروں حکماء کے بس میں نہیں ہوتا۔

ہم اگر اس حقیقت کو مدّ نظر رکھیں کہ ریاست مثلاً پاکستانی ریاست، برطانوی سامراج کی چھوڑی ہوئی ایک وراثت ہے اور اس کی حقیقت بھی سیکولر سرمایہ دارانہ جمہوریت ہے تو ہمیں نظر آئے گا کہ آج تک یہ ریاست اسلام کو پابند کرنے اور اسلامی اداروں کو نیست و نابود کرنے

میں کامیاب کیوں نہ ہوسکی؟ صرف اس لیے کہ پہلے دن سے دینی سیاسی جماعتوں نے اس راہ میں سیکولر طبقہ کو اَڑنگی لگا رکھی ہے۔ یہ رکاوٹ اگر آج ختم ہوجائے تو آئین کی اسلامی دفعات کو ایک دن میں اُڑا کر پاکستان کے سیکولر طبقات یہاں بھی مصر وشام کا ماحول بنانے اور اہل ایمان کے لیے کربلا پیدا کرنے میں دیر نہیں کریں گے۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ پاکستانی قوم نے ہر الیکشن میں دینی سیاسی جماعتوں کو ردّ کیا اور دیگر نعرہ بازوں کو گلے سے لگالیا مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا سراسر غلط ہے کہ دینی سیاسی جماعتوں کو میدانِ سیاست ترک کر کے اب مسجد و مدرسہ اور خانقاہ کی راہ لینی چاہیے اور جو بھی حکمران الیکشن یا مارشل لاء کے ذریعہ قوم کے سروں پر آ کر بیٹھ جائیں ان سے اصلاح وارشاد کا تعلق قائم کر لینا چاہیے تا کہ حکمرانوں سے کشمکش کا تعلق ختم ہو کر عقیدت ومحبت کے پرانے تعلقات بحال ہوجائیں اور جو اسلام آپ سیاست کے ذریعہ لانا چاہتے ہیں وہ بلا کشاکش دعوت ومحبت کی راہ سے آجائے اور پُرامن طریقہ سے غالب ہوجائے۔

یک حرف کاش کہ است
کہ صد جا نوشتہ ایم

اے کاش! ایسا ممکن ہوتا لیکن نہایت معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ یہ صورتِ واقعہ کا غلط تجزیہ اور حالات کی نہایت غلط تصویر کشی ہے۔ اس لیے ایسا ہونا بظاہر ناممکن ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ اسلامی ریاست تو بلاشبہ ایک بھرپور انقلابی عمل کے نتیجہ میں ہی قائم ہوگی جس کے ذریعہ موجودہ ریاستی اداروں کو مکمل زمین بوس کر کے ان کی ایک نئے اسلامی قالب میں صورت گری کر دی جائے گی لیکن تب تک اس ریاست کو اسلام اور غلبہ اسلام کی خواہش مند جماعتوں اور طبقات کو مٹانے سے روکنے کا بندوبست اور دفاع کا انتظام بھی تو کرنا ہے۔ یہ کام آج صرف دینی سیاسی انتخابی جماعتیں ہی کر رہی ہیں اور یہ انہی کے دم سے ہے کہ ہر شخص اور حلقہ اسلام کا کھل کر نام لے سکتا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ انتخابات سے مکمل اسلام کیوں نہیں آسکتا تو اس پر پھر بات کریں گے۔

فہم اسلام　　مدیر

مسئلہ تصویر

ایک صاحب نے پوچھا ہے کہ آپ کی رائے میں تصویر کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

دیکھیے! ہر دین اور تہذیب کا ایک تصور خیر وشر اور تصور حسن وقبح ہوتا ہے۔ اگر ہم اسلام کے تصور خیر وشر اور تصور حسن وقبح کی ترجیحات کو دیکھیں تو اس میں تصویر کہیں فِٹ بیٹھتی نظر نہیں آتی۔ چنانچہ تصویر کی حرمت کے بارے میں جو شرعی احکام وارد ہیں انہیں اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

یہ بات بھی پیش رہے کہ ہر فکر میں کچھ امور واضح طور پر خیر پر مبنی ہوتے ہیں اور کچھ واضح طور پر شر پر تاہم اکثریت ایسے امور کی ہوتی ہے جن میں شر اور خیر دونوں بیک وقت موجود ہوتے ہیں اگر کسی چیز میں شر کا پہلو غالب ہو تو شریعت اسے حرام قرار دے دیتی ہے اور اس کے برعکس اگر کسی چیز میں خیر کا پہلو غالب ہو تو شریعت اسے حلال قرار دیتی ہے۔ قرآن حکیم میں آتا ہے کہ شراب اور جوئے میں اگرچہ کچھ منافع بھی ہیں لیکن ان میں موجود شر کے غلبے کی وجہ سے شریعت نے انہیں حرام قرار دیا ہے۔

اسلام نے تصویر کو چونکہ حرام قرار دیا اس لیے مسلمانوں نے اپنی جمالیاتی حس کی تسکین کے لیے تصویر کشی اور مجسمہ سازی کی بجائے شعر وادب، تعمیرات میں منبر ومحراب اور نقش ونگار اور خطاطی وغیرہ پر زیادہ توجہ دی۔

مغرب کی تہذیب کے پیش نظر چونکہ صرف دنیا اور اس کی لذتیں، سہولتیں اور آسائشیں ہیں اور وہ بھی بغیر کسی قید کے لہٰذا تصویر ان کی ترجیحات میں اوپر آ گئی اور تصویر بھی خاص طور پر عورت کی جو انسان کے سفلی جذبات کو ابھارتی ہے جسے مغربی تہذیب کی مادہ پرستی، تجارتی ذہنیت اور شہوت پرستی کیش کرانا چاہتی ہے بلکہ کرا رہی ہے۔ اگرچہ اس کے بعض مفید پہلو بھی سامنے آتے ہیں لیکن چونکہ لطافت اور پاکیزگی اس تہذیب میں ہے ہی نہیں لہٰذا تصویر کا شہوت پرستانہ اور تاجرانہ استعمال اس میں غالب ہے۔

اب چونکہ مغرب کی تہذیب دنیا پر غالب ہے اور مسلمانوں کی تہذیب مغلوب ہے بلکہ مسلمانوں کی اکثریت اس پر خوش اور مطمئن ہے کہ اسے مغرب کی فکری غلامی سے متمتع ہونے

کا موقع ملا ہے تو ایسے میں جو تصویر کی مخالفت کرے گا وہ کٹ ملّا کہلائے گا۔لیکن آج تصویر کے مضرات سے بچنا بہت مشکل ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سود کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ آخری زمانے میں اتنا شائع اور غالب ہوجائے گا کہ جو اس میں ملوث نہیں ہوگا وہ بھی اس کے غبار سے بچ نہیں پائے گا۔یہی حال تصویر کا ہے کہ ہم میں سے کئی جو اس کے اضرار سے واقف ہیں اور اس سے بچنا چاہتے ہیں وہ بھی اس کے غبار سے بچ نہیں سکتے۔ چنانچہ بہت سے علماء اسلام نے اضطرار اور اسے بلوۂ عام سمجھتے ہوئے مجبوراً اس کے جواز کا فتوی دے دیا ہے اور بعض ایسے بھی ہیں جو اس کے فوائد گنواتے نہیں تھکتے۔خصوصاً اس حوالے سے کہ جب شر اس کو اپنے غلبے کے لیے استعمال کررہا ہے تو ہم اس کے ذریعے حق کی آواز اٹھانے کی کوشش کیوں نہ کریں؟

ہماری رائے میں شریعت اسلامی کا حرمت تصویر کا حکم مبنی بر حکمت اور مصلحت انسانی ہے اور مغربی تصور اس کے برعکس ہے لہٰذا اسے شر سمجھنا چاہیے اور اس کے مضرات سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔اور جو تہذیب اس کی مؤید اور علم بردار بن کر کھڑی ہے، اسے دلائل و براہین سے ردّ کرنا چاہیے۔اس کے ساتھ ہی اسلام اور اسلامی تہذیب کے غلبے کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔کم از کم اس کے غلبے کی خواہش وتمنا سے دست بردار نہیں ہونا چاہیے۔ تاہم عصری تمدن میں جہاں تصویر کی ضرورت ناگزیر ہو اور افادیت واضح ہو وہاں اس کے استعمال کے سوا کیا چارہ ہے؟

بقیہ: ''ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی اقبال شناسی''

خلاصہ یہ کہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم ایک بڑے آدمی تھے۔صاحبِ فکر اور صاحب الرائے تھے لیکن ہم نے ان کی قدر نہیں کی، ان کے فکر وعمل سے استفادہ نہیں کیا اور ان کے کام کو آگے نہیں بڑھایا۔معاصرین میں سے حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب اور مختار فاروقی صاحب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ وہ ان کا ذکر خیر کررہے ہیں۔

حالات کا دباؤ اتنا زیادہ ہے کہ لوگ زود رنج ہوگئے ہیں لیکن ہمیں توقع ہے کہ ہمارے دوست مختار فاروقی صاحب ہماری اس ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ سے محظوظ ہوں گے یا یہ ان کے لیے کم از کم گوارا ہوگی اور وہ اس پر ہم سے ناراض نہیں ہوں گے اور اپنا تعمیری کام جاری رکھیں گے، اللّٰھم زد فزد.

اسلام اور پاکستان

پروفیسر ملک محمد حسین

پاکستان کا دینی منظر نامہ

بظاہر اطمینان اور بباطن اضطراب - دینی سرگرمیوں کی کثرت اور نتیجہ صفر

اطمینان کی بات یہ ہے کہ ایک سیاسی اور مذہبی رہنما کی کال پر لبیک کہتے ہوئے ہزاروں لوگ کراچی سے چلتے ہیں۔ رحیم یار خان، بہاولپور، ملتان، ساہیوال، لاہور، گجرات، گوجر خان اور روات سے ہوتے ہوئے فیض آباد کے راستے اسلام آباد میں داخل ہوتے ہیں اور ایچ۔9 کے ایک کھلے میدان میں خیمہ زن ہوجاتے ہیں۔ اس لانگ مارچ میں امن امان کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا اور عوام الناس کے لیے کوئی زحمت پیدا نہیں کی جاتی۔ زندگی رواں دواں رہتی ہے اور ہزاروں لوگوں کا یہ مارچ بھی چلتا رہتا ہے۔ سمع و طاعت اور نظم وضبط کی یہ نادر مثال ہے جو دینی تعلیمات اور دینی تربیت کا نتیجہ ہے۔ یہ لوگ جم کر بیٹھے، موسم کی سختیاں برداشت کیں اور انہوں نے سردی کے موسم میں کھلے آسمان تلے راتیں گزاریں۔

یہ تو ایک تازہ منظر نامہ تھا جس کا ہم نے شروع میں ہی ذکر کر دیا۔ اس کے علاوہ دیکھیے کہ ۳۵ ہزار کے لگ بھگ دینی مدارس ہیں جو نئی نسل کو دینی علوم سے مزین کر رہے ہیں۔ ہر سال لاکھوں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں حفظ قرآن کی سعادت حاصل کرتی ہیں۔ لاکھوں نوجوان دینی مدارس سے فاضل بن کر نکلتے ہیں۔ جدید تعلیمی اداروں میں بھی پرائمری سے لے کر یونیورسٹی کی کلاسز تک اسلامیات کی لازمی تعلیم دی جارہی ہے۔ لاکھوں مساجد ہیں اور ان مساجد میں پانچ وقت کی نمازیں پڑھی اور پڑھائی جارہی ہیں۔ عام نمازوں میں تو شاید زیادہ لوگ نہیں ہوتے لیکن جمعۃ المبارک کے دن مساجد بھری ہوتی ہیں بلکہ مساجد کے باہر دُور دُور تک نمازیوں کی صفیں بچھی ہوتی ہیں۔ رمضان المبارک میں دینی ماحول اپنے جوبن پر ہوتا ہے۔ عیدالاضحیٰ کے روز ہزاروں لاکھوں جانور قربان کیے جاتے ہیں۔ ربیع الاوّل کے پہلے بارہ دنوں میں محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روح پرور مناظر پورے معاشرے میں فراواں ہوتے ہیں۔ ۱۲ ربیع الاوّل کے دن تو ملک کی پوری فضا درود وسلام سے معمور ہوتی ہے۔ جلسے، جلوس، ریلیاں اور حلوے مٹھائیاں ایک دلکش منظر بناتی ہیں۔ ملک میں حج عمرے کا شوق فراواں ہے۔ حج عمرے کا انتظام کرنے والی ٹریول ایجنسیوں کا کاروبار زوروں پر ہے۔ دین کی

طرف بلانے والوں اور دینی اجتماعیت کا اہتمام کرنے والی تبلیغی جماعت ، دعوتِ اسلامی ، جماعت اسلامی، تحریک اسلامی، منہاجِ القرآن اور اسی طرح کی دیگر درجنوں جماعتیں ہیں جن کے ساتھ لاکھوں، کروڑوں لوگ وابستہ ہیں۔ ملک میں سب سے زیادہ پبلشنگ دینی لٹریچر کی ہے۔ دینی رسائل اور جرائد کی تعداد بلاشبہ سینکڑوں میں ہے اور تبلیغ کی خاطر چھوٹے چھوٹے پمفلٹ بھی ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ حکمران بھی ریاست مدینہ بنانے کا عزم لیے ہوئے ہیں اور اپوزیشن بھی اسلام کے نام پر ہی حکمرانوں کی مخالفت پر کمربستہ ہے۔

یہ ہے وہ پورا منظرنامہ جو اس بات کا اطمینان دلاتا ہے کہ اسلام کے نام پر حاصل کیا ہوا یہ عظیم ملک اسلام کا گہوارہ بننے جا رہا ہے جہاں انصاف ہوگا، امن ہوگا، خوش حالی ہوگی اور جہاں حوا کی بیٹی عزت و آبرو کے ساتھ اپنی زندگی گزارے گی اور اس کا صنفی تقدس محفوظ ہوگا اور وہ اطمینان اور یک سوئی کے ساتھ مستقبل کی مسلمان نسل کو پروان چڑھائے گی اور اسے گھر کی چار دیواری میں ہر قسم کا معاشی اور سماجی تحفظ حاصل ہوگا۔ یہ امنگ بھی ذہن میں پیدا ہوتی ہے کہ لوگ آزاد ہوں گے، ان کے ذہن آزاد ہوں گے، انصاف مہیا کرنے کے لیے عدالتیں آزاد ہوں گی اور تحقیق و تخلیق کے لیے علمی ادارے آزاد ہوں گے۔ صاحبانِ علم کی عزت و توقیر ہوگی اور طالبانِ علم کے لیے علم کے سرچشمے والہانہ استقبال کر رہے ہوں گے۔ لوگ اپنی آزاد مرضی سے اپنی خواہشات اور اپنی آرزوؤں کے حصول کے لیے اسلامی، رفاہی اور جمہوری حکومت کی تشکیل میں آزاد ہوں گے جس کے نتیجے میں قوم کے سردار قوم کے خادم ہوں گے اور مستضعفین کی دست گیری اُن کی آہ وزاری کے بغیر کی جائے گی۔

لیکن ہائے افسوس کہ یہاں تو منظر ہی کچھ اور ہے۔ ہماری جوان بیٹیوں کو بسوں کا کنڈکٹر بنا دیا گیا۔ صنف نازک کو نیم برہنہ کر کے اشتہار بازی کا سامان بنا دیا گیا۔ عدالتیں ظلم کے اڈے بن گئیں اور دفاتر عوام کی ذلت و رسوائی کے اکھاڑے بنا دیے گئے۔ سیاستدان لوٹا پن کے شاہکار، علمائے کرام دین فروشی کے آلہ کار اور تعلیمی ادارے جہالت بانٹنے کے دکاندار۔ گالم گلوچ کو معاشرے کا شعار بنا دیا گیا ہے۔ منبر و محراب ہوں یا سیاسی اکھاڑے، سوشل میڈیا ہو یا ٹی وی چینلز، سب کے سب بدتہذیبی کو فروغ دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک ہیجان ہے جو معاشرے میں برپا ہے، ایک ہوس ہے جس کو بڑھایا جا رہا ہے۔ انسان حیران ہوتا ہے کہ یا اللہ میں کس معاشرے میں آ گرا ہوں۔ پریشانی اور پریشان حالی میں کوئی چھٹکارے کی راہ نظر

نہیں آتی۔ نفسیاتی الجھنوں میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔ سائیکالوجسٹ اور سائیکائرسٹ صاحبان کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ اعصابی اور ذہنی امراض کی ادویات کی مانگ روز افزوں ہے۔ ابنارمل لوگوں کی تعداد ناقابل یقین حد تک بڑھ چکی ہے۔ خودکشی کی شرح خطرناک حدوں کو چھو رہی ہے۔ جنسی جرائم اور ان جرائم کے بعد ہونے والی قتل کی وارداتوں میں خوفناک اضافہ ہوا ہے۔ انصاف معاشرے کو متوازن کرتا ہے لیکن یہ جنس بالکل ناپید ہے۔ منصفین اور انصاف کے سہولت کار یعنی وکیل حضرات بے لگام ہیں۔ ڈاکٹر ڈاکو کا روپ دھار چکے ہیں اور حد یہ ہے کہ اس سب کے باوجود حکمران ریاست مدینہ کے نام پر لوگوں کے بے وقوف بنائے چلے جارہے ہیں۔

ان حالات میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ اے ربّ کائنات! ہمیں ظلم کے اس ماحول اور ظلم کے اس نظام سے نجات دلا۔

بقیہ: مغربی معاشرت کے آزار: تنہائی، افسردگی اور مایوسی

مغربی معاشرے میں انفرادیت پسندی اور شخصی آزادی کی جو فکر پروان چڑھی اس نے خاندانی نظام کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اسی فکر کا نتیجہ ہے کہ نوجوان اپنی زندگی اکیلے اپنی مرضی سے جینا چاہتے ہیں دوسرے انفرادیت پسندی اور شخصی آزادی کا تصور اتنا راسخ ہو چکا ہے کہ اپنے قریبی رشتہ دار یا اپنے ماں باپ کو بھی یہ اجازت نہیں کہ وہ ان کی پسند کے خلاف کوئی بات کہہ سکیں۔

یہ نوجوان اپنے کریئر اور اپنے مستقبل کے لیے اپنے والدین کا بوجھ اٹھانا بھی پسند نہیں کرتے اور یوں بوڑھے والدین اپنی زندگیاں اولڈ ہاوس میں گزارتے ہیں یا اکیلے رہ کر ایسے ہی گھر میں اپنی آخری سانسیں لیتے ہیں اور پھر ان کی لاش سالوں بعد دریافت ہوتی ہے۔

اسلام میں خاندان کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور والدین کے حقوق اور اپنے اقارب اور ہمسایوں کے متعلق باقاعدہ احکام دیئے ہیں۔ اسلام میں مضبوط خاندان کو معاشرہ کی اکائی قرار دیا گیا ہے۔ مضبوط خاندان کی وجہ سے جہاں بچوں کو سرپرستی میسر رہتی ہے وہیں بڑوں کو بھی اپنے بڑھاپے میں سہارا میسر رہتا ہے۔

اسلام اور پاکستان پروفیسر ملک محمد حسین

دینی سیاسی جماعتوں کے موثر اور کامیاب ہونے کا منہج

پاکستان میں معاشرہ جن حلقوں میں تقسیم ہے ان میں بودوباش کے لحاظ سے ایک شہری و قصباتی حلقہ ہے اور دوسرا دیہاتی حلقہ۔ نظریاتی تقسیم کے لحاظ سے ایک طبقہ لبرل و سیکولر لوگوں کا ہے تو دوسرا مذہبی حلقہ۔ مذہبی حلقہ میں دو بڑے گروہ ہیں ایک سنی اور ایک شیعہ۔ مزید یہ کہ سنی حلقہ میں غالب تعداد بریلوی مکتب فکر کی ہے۔ اس کے بعد دیوبندی مکتب فکر کے حامل لوگ ہیں اور پھر سلفی یا اہلحدیث مسلک کے لوگ۔ سیاسی طور پر معاشرے کا کنٹرول گاؤں سے شروع ہوتا ہے اور یونین کونسل سے ہوتا ہوا ضلع کونسل، ایم پی اے کا حلقہ اور ایم این اے کا حلقہ سے سیاسی جماعت کے اثر ورسوخ پر ختم ہوتا ہے۔ محدود اور توسیع یافتہ برادریاں بھی اپنا رول ادا کرتی ہیں۔ دیہاتی سطح پر سیاسی اثر ورسوخ کا یونٹ گاؤں ہے اور شہروں میں محلہ اور وارڈ کی حیثیت ہوتی ہے۔ سیاسی اثر ورسوخ حاصل کرنے اور الیکشن میں ووٹ لینے کے لیے شہروں اور دیہاتوں میں سیاسی یونٹوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی سیاسی جماعت ان سیاسی یونٹوں میں اپنے سیاسی اثر کو مضبوط کر لیتی ہے تو درجہ بدرجہ اوپر کے بڑے یونٹوں یعنی ضلع کونسل کا چیئرمین ایم پی اے اور ایم این اے کی سطح پر اپنا اثر دکھا سکتی ہے۔

دینی سیاسی جماعتوں خصوصاً کسی ایسی دینی جماعت کے لیے جو مسلک اور فرقہ واریت سے بالاتر ہو، ضروری ہے کہ وہ سیاسی اثر ورسوخ کے سب سے نچلے یونٹ پر توجہ دے۔ اس توجہ میں جماعتی نعرہ بازی کم اور عوامی خدمت پر زور زیادہ ہو اور جب کوئی شخصیت مقامی معاشرے میں نمایاں ہو جائے تو لوکل انتخابات میں اسے سامنے لایا جائے۔ اس طرح آہستہ آہستہ لوکل سطح کی قیادت جب قبضہ میں آجائے تو اوپر کی سطحوں پر نمائندگی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر فوری طور پر نمائندگی نہ بھی ملے تو قومی اور صوبائی حلقوں میں منتخب نمائندوں پر اثر ورسوخ قائم کیا جائے۔ اس لائحہ عمل پر تسلسل کے ساتھ عمل کیا جائے تو دیرپا سیاسی قوت حاصل کی جاسکتی ہے اور قومی و مقامی فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ دینی حلقوں میں کوئی ہے جو اس فکر کو آگے بڑھائے اور معاشرے میں خیر کے فروغ کا باعث بنے۔

اسلام اور مغرب/ڈائیلاگ

ڈاکٹر طفیل ہاشمی/مدیر

مطالعۂ استشراق کے جدید منہج کی ضرورت؟

میں نے اپنے تحقیقی مطالعے کے دوران عربوں کے یونان، روم، اسکندریہ، ہندوستان اور ایران سے علمی استفادے کی تاریخ بالاستیعاب پڑھی تھی، اس کے بعد مسلم علوم کے یورپ پر اثرات کا تفصیل سے مطالعہ کیا تھا۔ میرے پاس ایسی اصل کتب بھی تھیں جن میں سائنسی تجربات کے پہلو بہ پہلو گنڈے، ٹوٹکے اور منتر بھی مذکور تھے۔ مسلم مترجمین نے سائنسی اکتشافات کو لے لیا اور توہمات کو نظر انداز کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ عربوں کے پاس کتاب اللہ کی سادہ تعلیمات، چند عقائد، عبادات اور اخلاق کے سوا کوئی ایسے علوم نہیں تھے جو تمدن کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ انہوں نے یہ ساری ضروریات متمدن تہذیبوں سے لے کر انہیں توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان کی کٹھالی سے گزار کر ساری دنیا کو ہر پہلو سے ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ علم کے پیاسے تھے اور جہاں سے علم مل سکے، کسی تعصب کے بغیر لے لیتے تھے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ کاروان علم پچھلی چند صدیوں سے مشرق سے کوچ کر کے مغرب میں جا آباد ہو گیا۔ ابتداء اسلام کی بازنطینی اور مسیحی مقبوضات کو دنیا کے نقشے پر دیکھنے اور جس تیز رفتاری سے اسلام نے ان سے وہ سب ممالک چھین لیے انہیں تاریخ میں پڑھنے کے بعد ان کی اسلام دشمنی، اسلام سے تعصب، اسلامی تعلیمات اور مقدسات سے نفرت بجا طور پر قابل فہم ہے۔ ان کا بظاہر ناقابل تلافی نقصان ہو گیا تھا لیکن انہوں نے نفرت پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی کھوئی ہوئی طاقت حاصل کرنے کے لیے مسلم جامعات اور اسلامی سکالرز کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے اپنے سماج کی خدمت کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ ہم اس حقیقت کا ادراک کرنے کی بجائے کہ ہم زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں اپنی محنت کو دوبالا کر دیں، اپنے مسل مضبوط کریں اور جہاں وہ پہنچ چکے ہیں وہاں سے شروع کر کے آگے بڑھیں، ہماری بیشتر توانائیاں ان کے عیوب گنوانے، ان کی کوتاہیاں شمار کرنے، ان کی بددیانتیاں گننے اور ان کے تعصّبات کا ماتم کرنے میں صرف ہو جاتی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے رویے میں چند مثبت تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے:

۱۔ ہمیں یہ ماننا چاہیے کہ ان کے اقتدار اور تہذیب کو جس قدر ہم سے نقصان پہنچا تھا اس پر ان کا غم و غصہ، نفرت و توہین بے جا نہیں تھا۔

۲۔ ان کا انسانیت پر احسان ہے کہ وہ مشترکہ انسانی ورثہ جسے ہم نے ایک ہزار سال تک ترقی دی انہوں نے نہ صرف سنبھالا بلکہ اسے مزید آگے بڑھایا اور اس وقت وہ ساری انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہے۔

۳۔ ہمیں ان علوم و نتائج سے نہ صرف استفادہ کرنا چاہیے بلکہ ان میں مزید مہارت بہم پہنچا کر اپنے حصے کا کام کرنا چاہیے۔

۴۔ اسلامی علوم کے حوالے سے ہمیں ان کا احسان مند ہونا چاہیے کہ ہماری ہزار ہا نایاب کتب اور علمی خزانے انہوں نے محنت شاقہ سے بہترین شکل میں ایڈٹ کر کے دنیا تک پہنچائے اور ہمارے لیے تحقیقی کام آسان تر کر دیے۔

۵۔ ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ ان کی غلط فہمیاں، تعصّبات اور نفرتیں دور کر کے انہیں محبت کا پیغام دیں کیونکہ وہ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت دعوت ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس پیغام کو ہر ہر فرد تک پہنچائیں۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ استشراق کا مطالعہ ایک مختلف زاویے سے کیا جائے جس کی اساس قرآن پاک میں ''تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ؕ ''[آل عمران ۳: ۶۴] میں بیان ہوئی ہے۔ اور یہ امر ملحوظ رکھیں کہ وہ اس ایمان اور عقیدت کے حامل نہیں جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔ اس لیے ان کی تعبیرات ہم سے مختلف ہوں گی۔

البرہان کا موقف

ڈاکٹر طفیل ہاشمی صاحب اگرچہ میرے لیے بہت محترم ہیں لیکن استشراق کے حوالے سے ان کی رائے میں چونکہ بعض لحاظ سے توازن کی کمی محسوس ہوئی اس لیے کچھ گزارشات پیش

خدمت ہیں:

۱۔ مغرب نے دانش مندی کی کہ اس نے ہم سے ہمارا مذہب اور ہماری تہذیب نہیں لی جو بلاشبہ Value Loaded تھی بلکہ ہم سے وہ علوم وفنون لیے جو زیادہ تر Value Neutral ہیں اور پھر انہیں اپنے رنگ میں ڈھال کر استعمال کیا۔

۲۔ لیکن ہم چونکہ مغرب کے غلام رہے ہیں اور بظاہر آزادی کے بعد بھی مغرب نے اپنے سیاسی، معاشی اور حربی تفوق کی وجہ سے اپنی تہذیب اور اپنا دین (سیکولرزم، لبرل ازم وغیرہ چونکہ ان کا طرز زندگی ہے لہٰذا ان کا دین ہی ہے) ہم پر مسلط کرنے کی کامیاب جدوجہد کی۔ اس لیے ہمارے معاشرے کے حکمران طبقات بلکہ زندگی کے ہر شعبے بشمول شعبۂ تعلیم کے بے شمار افراد آج بھی مغرب کے فکری غلام ہیں لہٰذا وہ مغرب سے مرعوب ومتاثر ہو کر اس کی تقلید اعمی پر اُتر آتے ہیں جس کا نقصان دہ ہونا واضح ہے اور ہر ذی شعور جانتا ہے کہ ہماری بہتری اپنے نظریۂ حیات سے وابستگی میں ہے نہ کہ ماسوا اسلام کسی دوسرے نظریہ سے وابستگی میں۔

۳۔ مغرب نے جب مسلمان ملکوں پر قبضہ کر لیا تو غلاموں کے مذہب، معاشرت، تمدن، رویوں کی تفہیم کے لیے، ان کے علوم وافکار کو حقیر ثابت کرنے کے لیے، مسلمانوں کے ذہن میں تشکیک پیدا کرنے کے لیے اور انہیں اپنے قابل فخر ماضی سے کاٹنے کے لیے 'مطالعۂ استشراق' کا علمی ڈسپلن ایجاد کیا جس نے یہ خدمت بخوبی سرانجام دی تاہم بلاشبہ ضمناً اس حوالے سے مفید علمی کام بھی ہوئے جن سے مسلمان اہل علم فائدہ اٹھاتے ہیں۔

۴۔ مسلمان ہل علم کا کام یہ ہے کہ اپنے نظریۂ حیات، اپنے ورلڈ ویو اور اپنے نظریۂ علم پر قائم رہتے ہوئے عمرانی اور سائنسی علوم میں تخلیقی تحقیق کو فروغ دیں اور مسلم امت کو زوال سے نکالنے میں اپنا حصہ ڈالیں۔ اور ہاں! کیا ہم سوچ سکتے ہیں کہ جس طرح مغرب نے اپنے مفاد کے لیے 'مطالعۂ استشراق' کی راہ نکالی تھی، کیا مسلم اہل علم بھی 'مطالعۂ مغرب' کا کوئی ڈسپلن ایجاد کر سکتے ہیں تاکہ ہم بھی مسلم اُمہ کے بارے میں مغرب کی پالیسیوں، ترجیحات اور رویوں کا تفہیمی وتنقیدی مطالعہ کر سکیں؟

تفہیم مغرب

پروفیسر محمد عاصم حفیظ

مغربی معاشرت کے آزار: تنہائی، افسردگی اور مایوسی

ہم مغربی معاشرت کی ناکامی سے سبق سیکھنے کی بجائے اسے اپنانے کی احمقانہ خواہش میں کیوں مبتلا ہیں؟

اسپین میں گزشتہ دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہر ایک کو ہلا کر رکھ دیا۔ میڈرڈ کے ایک گھر میں ایک خاتون کی لاش ۱۵ سال تک پڑی رہی، کسی نے نوٹس ہی نہ لیا۔ خاندان، دوست احباب، ہمسائے، دفتر والے، کسی کو احساس ہی نہ ہوا کہ ایک جیتی جاگتی خاتون کہاں چلی گئی ۔ بے حسی کی انتہا۔ نام نہاد آزادئ نسواں اور عورت کی آزادی کے کھوکھلے نعرے لگاتے مغرب زدہ طبقات کے لیے ایک عبرت ناک کہانی۔ دردناک حقیقیت یہی ہے کہ تنہائی بے حس بنا دیتی ہے اور آپ کسی کے لیے بھی اہم نہیں رہتے۔ میڈرڈ کے نواحی علاقہ میں گزشتہ دنوں اسپین کی قومی پولیس نے ۷۸ سالہ خاتون کی لاش اس کے گھر کے غسل خانہ سے برآمد کی جو ۲۰۰۴ء کے قریب اپنے گھر کے غسل خانہ میں نہاتے ہوئے پھسل کر فوت ہوگئی تھی۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ رہتی تھی لیکن اس کے چھوڑ جانے کے بعد اکیلی تھی۔ خاتون گھر میں اکیلے رہائش پذیر تھی۔ ہمسایوں نے کچھ سال قبل مقامی پولیس کو اس خاتون کی بابت اطلاع دی کہ کافی عرصہ سے نظر نہیں آئی۔ پولیس نے روایتی طور پر گھر جا کر دروازہ کھٹکھٹا کر خانہ پوری کر دی۔ اس کے بنک اکاونٹ سے بجلی پانی کے بل ادا ہو رہے تھے اسی لیے کسی کو فکر ہی نہ ہوئی۔ خاتون کا خاندان بھی تھا لیکن ۱۵ سال تک کسی کو اس سے ملنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ اب ۱۵ سال بعد خاتون کے کسی جاننے والے نے جب دوبارہ پولیس سے رابطہ کیا تو فائر بریگیڈ کی مدد سے اس کی بالکونی کے ذریعے جب اندر داخل ہوا گیا تو خاتون کی لاش غسل خانہ میں دریافت ہوئی۔

کتنا حیران کن ہے کہ ایک اٹھہتر سالہ خاتون اکیلے رہائش پذیر تھی اور اس کی لاش ۱۵ سال تک گھر میں پڑی رہی اور خاتون کا کوئی قریبی رشتہ دار، کوئی خونی رشتہ دار اس کی خیریت دریافت کرنے یا اس کو تلاش کرنے نہ پہنچا اور بلڈنگ کے ہمسایوں کو بھی اس کی بابت یہ علم نہ ہوسکا کہ وہ کہاں غائب ہے۔

دوسری جانب عالمی میڈیا پر ایک اور رپورٹ نے سب کو چونکا دیا ہے۔ مغربی ممالک تنہائی کا شکار افراد کے لیے وزارتیں تک قائم کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ ایک حالیہ ریسرچ میں جرمن دارالحکومت برلن کو تنہا لوگوں کا شہر قرار دیا جا رہا ہے۔ ہر دوسرے گھر میں فردِ واحد مقیم ہے۔ اس شہر میں تنہائی ایک وبا کی طرح پھیل چکی ہے۔ جرمن چانسلر انجیلا میرکل کی سیاسی جماعت کرسچن ڈیموکریٹک یونین کی برلن برانچ نے اپنی لیڈر سے درخواست کی ہے کہ ملکی دارالحکومت میں تنہائی کے روگ کو ختم کرنے کے لیے ایک نیا منصب تخلیق کیا جائے اور اِسے ’’کمشنر برائے انسدادِ تنہائی‘‘ کہا جائے۔ اس وقت خاص طور پر بڑی عمر کے افراد زیادہ تنہائی کا شکار ہیں۔

برلن میں کئی ایسی تنظیمیں ہیں جنہوں نے عمر رسیدہ افراد کی دل بستگی کے لیے ایسی ویب سائٹ بنا رکھی ہیں، جن پر وہ ہلکی پھلکی گپ شپ یا پرلطف پیغام رسانی یا مختلف موضوعات پر خیالات کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔

۲۰۱۸ء میں برلن کے اخبار ٹاگس اشپیگل میں ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی جس کے مطابق تنہائی کے شکار لاکھوں لوگوں کے لیے صرف ۱۳۰۰ رضا کار دستیاب ہیں۔ اسی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ سن ۲۰۱۸ء کے دوران اپنے اپارٹمنٹ یا مکان پر تنہا رہنے والے ۱۳۰۰ انسان اپنی زندگی یاسیت کی فضا میں ہار گئے تھے۔ صرف بزرگ ہی نہیں بلکہ بیس سال سے کم عمر ہر چار میں ایک نوجوان کو بھی تنہا ہونے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تنہائی کو جدید ترقی یافتہ دور میں ایک عالمی وبا قرار دیا جا رہا ہے۔ برطانیہ میں گزشتہ سال تنہائی کی وزارت قائم کر دی گئی۔ برطانیہ میں ایک ریسرچ رپورٹ نے واضح کیا کہ وہاں ۹۰ لاکھ افراد کو تنہائی کا سامنا ہے۔ ایک برطانوی غیر سرکاری تنظیم کے مطابق تنہائی کی وجہ سے نوجوان یا بڑی عمر کے لوگوں میں منشیات کے استعمال کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ یہی تنہائی ڈیپریشن کا بھی ایک بڑا سبب خیال کی جاتی ہے۔ ایک امریکی ریسرچ ادارے کے مطابق امریکا میں سن ۱۹۹۰ء اور سن ۲۰۰۰ء میں پیدا ہونے والی نسل میں تنہائی کا مسئلہ بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ دوسری جانب مغربی ممالک میں ایک انڈسٹری جنم لے رہی ہے جس میں بعض افراد معاوضہ لے کر دوسروں سے کچھ وقت باتیں کرتے ہیں۔ تنہائی کا شکار افراد رقم خرچ کر کے ایسے افراد کے ساتھ ملاقات کرتے ہیں اور ان کے ساتھ دل کی باتیں کرتے ہیں۔ امریکہ میں لاکھوں لڑکیاں ’شوگر بے بی‘ بن کر بزرگوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان میں سے اکثریت کا مقصد صرف گھر میں ایک فرد کی موجودگی ہوتا ہے۔ (بقیہ ۴۶ پر)

عالم اسلام

ڈاکٹر شفیق انجم[1]

چین میں مسلمانوں پر مظالم کا آنکھوں دیکھا حال (آخری قسط)

چینی ترکستان (سنکیا نگ) میں ایغور مسلمانوں کے دردناک حالات کا چشم کشا مشاہدہ

لوگوں کو غلام بنانے کا نتیجہ کیا نکلے گا؟

معلوم نہیں چینی حکومت کے سماجی اہداف کیا ہیں لیکن لوگوں کو غلام بنا کے رکھنے کے نتائج تاریخی طور پر ہمیشہ خوفناک ہی نکلے ہیں۔ ایغوروں کی بپتا سے ہٹ کر خود چینی باشندے بھی اپنی حکومت کے طرزِ عمل سے مطمئن نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نہ کسی بہانے بیرون ملک نکلنے رواج بڑھ رہا ہے۔ اور جو ایک دفعہ باہر جاتا اور آزادی کی چند سانسیں لے پاتا ہے، واپسی اس کے لیے کوئی خوشگوار تجربہ نہیں ہوتی۔ چین کی امریکہ اور یورپ کے ساتھ تجارتی محاذوں پر جنگ کی سی صورت حال ہے لیکن سماجی سطح پر دیکھا جائے تو چینی نوجوان لڑکے لڑکیوں کا آئیڈیل امریکہ و یورپ ہے۔ وہ وہاں جانے کے لیے ایسے کورسز کو ترجیح دیتے ہیں جن میں سیکنڈ آپشن کے طور پر انگلش، فرنچ، اٹالین یا دیگر یورپی زبانیں ہوں۔ اسی خواہش کے تحت ملٹی نیشنل کمپنیوں میں ملازمت کی طرف رغبت زیادہ ہوئی ہے۔ بڑے شہروں میں جگہ جگہ ایسی اکیڈمیاں کھل گئی ہیں جن میں انگلش اور دیگر یورپی زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔ ان اکیڈمیوں میں رش کا عالم دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ چینی نوجوان نسل کیا چاہتی ہے۔ اس بدلتی ہوئی صورتحال میں چینی حکومت کا چین پرستی کا سخت موقف اگر بدلے گا نہیں تو خدشہ ہے کہ کہیں ٹوٹ نہ جائے!

اگرچہ حکام نے ٹیکنالوجی کی مدد سے سب کو حسب موافق بیڑیاں پہنا رکھی ہیں اور حکومتی و پارٹی منشور کو مذہب کا درجہ دے کر سب پر اس کی تعمیل واجب کر رکھی ہے لیکن آثار بتاتے ہیں کہ ذہنوں میں بے چینی موجود ہے۔ لوگ تھک رہے ہیں، مایوس ہو رہے ہیں اور غم و غصے کا اظہار بھی کر رہے ہیں۔ ایسے میں اگر آبائی ہم وطنوں کے ساتھ سنکیا نگ، تبت اور منگولیا کے محکوم لوگوں کی بابت انصاف کی کوئی راہ نہ نکالی گئی تو بجھی راکھ سے بھی چنگاریاں بھڑک اٹھنے کا

---

[1] راولپنڈی 0334-5503953

احتمال رہے گا۔ عالمی سطح پر اس صورتحال کو کیش کرانے کی کوششیں بھی اب تیز ہونے لگی ہیں اور روس کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے چین کی وحدت کو نقصان پہنچنے کا خطرہ پہلے سے کہیں زیادہ ہو گیا ہے۔ چینی حکومت نے بجا طور پر غربت اور بے روزگاری کے خلاف جنگ لڑی ہے اور اپنے لوگوں کی فلاح کے لیے بے پناہ محنت کی ہے لیکن اپنے مقبوضہ علاقوں میں اس کے ظلم بھی یادگار ہیں۔ ان مظالم میں کمی کی کوئی صورت ممکن ہو سکے اور باہمی بھائی چارے اور محبت کے رویے کے ساتھ چین اپنی وحدت کے استحکام اور وقار کی کاوش کرے تو جدید دنیا میں اس سے اچھا ملک شاید ہی کوئی ہو۔ قیام سنکیانگ کے دوران بار بار یہی خیال آیا کہ کاش چینی حکومت ہوش کے ناخن لے اور رواداری کے ساتھ غیر قوموں کو بھی انسان سمجھے اور انہیں جینے کا حق دے تا کہ یہ لوگ بھی فخر سے کہہ سکیں کہ ہاں ہم چینی ہیں اور ہم خوش ہیں۔

چینی بن کر زندہ رہو یا مر جاؤ

چینیوں اور ایغوروں میں ثقافتی اور تہذیبی فرق ایسا واضح ہے کہ اسے کسی یکساں اصول قاعدے کے تحت نہیں لایا جا سکتا۔ دونوں قوموں کے عقائد و توہمات، نظریہ ہائے زندگی اور رسومات و مشاغل الگ الگ ہیں۔ سنکیانگ نسلوں نسل سے ایغوروں کا ہے۔ چینی یہاں سال ہا سال کی سکونت کے بعد بھی بدیسی ہیں۔ یہ مٹی انہیں اپنا کہنے پر تیار نہیں لیکن چینی حکومت مصر ہے کہ سنکیانگ چینیوں کے علاوہ کسی کا نہیں۔ چین کی ماضی کی حکومتوں کی سنکیانگ کے حوالے سے سوچ اعتدال پسندانہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایغور اٹانومس ریجن کے طور پر اس علاقے کو داخلی خودمختاری بھی دی اور اس کا احترام بھی کیا۔ لیکن بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے بعد سے چینی حکومت نے جس طرح اس علاقے کا ناک نقشہ بدلنے کا سوچا ہے وہ بہت جارحانہ ہے۔ یعنی واضح پیغام ہے کہ ایغور یا تو سیدھے سبھاؤ چینی بن جائیں، یا ذلت آمیز صورت میں زندہ رہیں یا مر جائیں، اس کے علاوہ کوئی آپشن نہیں۔ ایسے میں بہت سے ایغوروں نے چینی بننے کے آپشن کو مناسب جانا اور ایسا کر بھی دکھایا لیکن پھر بھی انہیں ہمیشہ نا قابل اعتبار ہی سمجھا گیا۔ چینی حلقوں میں ان کی کوئی عزت نہیں۔ یہ لوگ حکومتی مشینری میں اعلیٰ عہدے بھی رکھتے ہیں اور بہت قابل پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر اور کاروباری لوگ بھی ہیں لیکن نسلاً ایغور ہونا ان کے لیے ایک تہمت بنا رہتا ہے۔ ایک بہت سینئر ایغور پروفیسر سے جو یورپ اور امریکہ کی

یونیورسٹیوں سے پڑھ کر آئے تھے، بات چیت ہوئی تو یہ موضوع چھڑنے پر روہانسے ہو گئے اور چپ ہو کر سر جھکا لیا۔ یہی صورت حال زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی کرنے والے ایغوروں کی کہانیوں سے چھلکتی نظر آئی۔ تو ایسے میں وہ لوگ بہت کامیاب رہے جنہوں نے موت کو ترجیح دی کیونکہ جو زندہ ہیں ان کی کہانیاں ایسی لرزہ خیز ہیں کہ مرنے والوں کی قسمت پر رشک آتا ہے۔

چین سنکیانگ سے جانے کا نہیں اور یہ طے ہے کہ ایغوروں کو بھی نہیں چھوڑنا۔ پس سرحدیں سِیل ہیں اور ایسی سِیل کہ کوئی پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا ہے۔ شہروں شہر ناکہ بندی ہے اور ایسی ناکہ بندی ہے کہ ایک شہر کی ہوا بھی دوسرے شہر جانے سے گریز کرتی ہے۔ شہروں اور قصبوں کے اندر ہر ہر کالونی کی الگ الگ ناکہ بندی ہے۔ ہر کالونی کی ہر منزل کی الگ ناکہ بندی۔ ہر منزل کے ہر گھر کی الگ ناکہ بندی۔ اور ہر گھر کے ہر فرد کی الگ ناکہ بندی۔ اتنے حصار اور اتنے کڑے حصار ہیں کہ بے بسی سینہ پیٹتی اور بَین کرتی رہتی ہے لیکن کوئی نہیں سنتا۔ غنڈہ گردی ایسی ہے کہ جب جس کو اٹھانا ہوا اٹھا لیا جاتا ہے۔ ایک ایک قیدی کے لیے چھپے چھے بم پروف گاڑیوں کا قافلہ چلتا ہے اور معلوم نہیں جانے والا کہاں جاتا ہے۔ شہروں شہر بکتر بند گاڑیوں میں دہشت گشت کرتی رہتی ہے۔ ٹینک اور راکٹ بردار گاڑیاں چوکوں چوراہوں میں کھڑی ہیں۔ ہر ہر فرد کے اوپر ایک ایک کیمرہ لگا دیا گیا ہے۔ جگہ جگہ پولیس سٹیشن ہیں۔ فوج الگ سے تیار و چوکس کھڑی ہے۔ تو ایسے میں یہ کہنا کہ یہ سارا اہتمام حفاظت کے لیے ہے کتنا مضحکہ خیز لگتا ہے۔ کیا حفاظت کا یہ اہتمام چین کے باقی شہروں میں بھی ہے؟ کیا بیجنگ، شنگھائی اور گوانگ زو جیسے عالمی اہمیت کے حامل شہروں میں اس سے زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں؟ جواب ملتا ہے کہ نہیں، کیونکہ وہاں ایغور نہیں۔ تو گویا ایغوروں کا ہونا چین کی سلامتی کے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھ لیا گیا ہے۔ اس خطرے سے نمٹنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان پر ٹینک چڑھا دیے جائیں۔ انہیں اپنے ہی وطن میں بے وطن کر کے اذیت ناک موت دے دی جائے۔ ان کی نسلیں اجاڑ دی جائیں کیونکہ ان کا قصور یہ ہے کہ یہ نسلاً چینی نہیں (اور مسلمان ہیں)۔ چین میں نسلاً چینی نہ ہونے کا مطلب سنکیانگ کے ایغوروں کے ساتھ ساتھ تبت اور منگولیا کے لوگ بھی جانتے ہیں۔ ان پر بھی توپیں اور ٹینک چڑھے ہوئے ہیں اور اقرار نامے،

وفاداری نامے لکھ لکھ کر اور منت وزاری کر کر اور اذیتیں سہہ سہہ کر ان کے ذہن وجسم بھی شل ہو چکے ہیں لیکن رہائی و چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں۔

کوئی حل بھی ہے؟

سنکیانگ چینیوں کا ہے اور سنکیانگ کے باشندے بھی چینیوں کے۔کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ مگر دوست کو دوستی کا حوالہ دے کر درخواست تو کی جاسکتی ہے....اگرچہ واضح ہے کہ شنوائی کی کوئی صورت نہیں۔کسی طور کسی کا دل نہیں پسیجے گا،کسی طور کوئی آمادۂ رحم نہ ہوگا کہ طاقت ، بے مہار طاقت فریادیں نہیں سنتی،حکم لگاتی ہے،حکم نافذ کرتی ہے اور مظلوم و بے کس لوگ مرتے ، اذیت ناک موت مرتے رہتے ہیں۔تاریخ انسانی میں ایسا ہوتا رہا ہے اور ہر جغرافیے سے جڑی کہانیوں میں یہ بات مشترک ہے کہ زوروالے زیردستوں پر چڑھ دوڑے اور انسانیت انہیں دیکھ دیکھ کر شرماتی رہی۔ترقی اور ارتقاء کے خروش میں خون کی ندیاں بہائی جاتی رہیں اور کوئی کسی کے لیے کچھ بھی نہ کرسکا۔دکھ ہوتا ہے اور آدمی سوچتا ہے کہ آخر انسان ترقی اور کمال کی منزلوں پر پہنچ کر بھی دوسروں کو معاف کرنا اور جینے کا حق دینا کیوں نہیں سیکھ پاتا؟ اپنے بچے اپنے ہیں تو دوسروں کے بچے بھی اپنوں کی طرح کیوں نہیں لگتے؟ رنگ نسل قوم قبیلے اگر تفاخر کا باعث ہیں تو اپنے تفاخر کے ساتھ دوسروں کے تفاخر کا احترام کیوں نہیں کیا جاتا؟ تجارت ، کاوبار اور مال واسباب کی دوڑ دھوپ اگر زندگی کے لیے ہے تو پھر یہ سب کچھ پانے کی خواہش میں زندگی ، زندگی کو کیوں کاٹ کھاتی ہے؟ شاید انسان طاقت کے نشے میں اندھا ہو جاتا ہے۔ شاید انسان مٹی کے فیصلوں کو بھول جاتا ہے اور حاکم بن کر ہمیشہ کی حاکمیت کا خواب دیکھنے لگتا ہے۔خدا بننا چاہتا ہے۔لیکن جان لینا چاہیے کہ زمین حاکم تو پالتی ہے لیکن کسی کو خدا نہیں بننے دیتی۔یہ زمین کی سرشت ہے اور یقیناً آسمان کی سرشت بھی یہی ہے۔ایسے میں کیا ہی اچھا ہو کہ انسان ، خدا بننے کے فریب سے نکل کر انسانیت کی بھلائی کی فکر کرے۔حاکم محکوموں پر مہربانی کریں اور محکوم حاکموں سے محبت کا تعلق رکھیں تو سب کی زندگیوں میں خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں۔اور اگر ایسا نہیں تو زمین کے کروٹ بدلنے کا انتظار کچھ زیادہ دیر نہیں کرنا پڑتا اور اس دوران میں یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ آسمان خود زمین پر اُتر آئے اور حاکم و محکوم کا فیصلہ کردے۔

تبصرۂ کتب مدیر

ماہنامہ 'حکمتِ بالغہ' جھنگ کا خصوصی شمارہ

''ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی اقبال شناسی''

۱۔ ماہنامہ 'حکمتِ بالغہ' جھنگ ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کی فکر کے تحت کئی شہروں میں قائم قرآن اکیڈمیوں میں سے ایک، قرآن اکیڈمی جھنگ، کے تحت شائع ہوتا ہے۔ اس کے مدیر شہیر جناب انجینئر مختار فاروقی صاحب ایک محنتی، باصلاحیت اور جذبے والی شخصیت ہیں اور ان کا دیگر مصروفیات کے باوجود ہر سال اپنے جریدے کا ایک ضخیم خصوصی نمبر نکالنا کسی کرامت سے کم نہیں۔ ہمارے زمانے میں کہ ہر سو فساد پھیل رہا ہے، بلکہ پھیل چکا ہے، حق کے لیے اٹھنے والی ہر آواز ہماری حمایت کی متقاضی ہے اور ہم 'حکمتِ بالغہ' اور اس کے مشن کے مویدین میں سے ہیں۔ تاہم ہلکے پھلکے اختلاف فکر و نظر کو زندگی اور حرارت کی علامت سمجھنا چاہیے جو ماحول کے جمود اور یبوست کو کم کرتی ہے لہٰذا ہمارے اس تبصرے کو اسی تناظر میں لینا چاہیے۔

۲۔ 'ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی اقبال شناسی' جیسے اہم موضوع پر ۳۳۶ صفحات کا دلچسپ خصوصی شمارہ لیکن فہرستِ مضامین ندارد۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ رسالے کے اندر ہے کیا؟ بار بار ڈھونڈنا پڑتا ہے، نشانیاں لگانا پڑتی ہیں۔ ماشاء اللہ آپ نے اتنی محنت کی ہے، اتنا اچھا کام کیا ہے، اس کی مبسوط فہرست ہونی چاہیے تاکہ قاری کو اپنی پسند کے مضامین تک رسائی میں آسانی رہے۔ جہاں آپ نے ۳۳۶ صفحات اس کام کے لیے مختص کیے ہیں وہیں دو صفحات اور سہی۔

۳۔ بحیثیت شاعر، فلسفی اور اسلامی دانشور ہم اقبال کی عظمت کے قائل اور اس کی خوبیوں کے مداح ہیں۔ ان کی شہرت، نیک نامی اور فکر بلاشبہ اسلامی قوتوں کے لیے سرمایہ ہے اور اس سرمایے کو اپنے حق میں استعمال کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں لیکن .... کوئی ربع صدی پہلے کی بات ہے۔ ایک صاحب ہوا کرتے تھے ڈاکٹر محمد یوسف گورایا (اللہ تعالیٰ انہیں جنت نصیب فرمائیں)۔ انہوں نے نوائے وقت میں ایک مضمون لکھا کہ اقبال مجتہد تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ بلاشبہ اقبال میں بہت سی خوبیاں تھیں اور ان کے مداح ان کو جو القابات بھی دیں وہ ان پر سجتے ہیں لیکن انہیں مجتہد کہنا خواہ مخواہ کا مبالغہ ہے، جس سے پیچیدگیاں پیدا ہوں گی کیونکہ 'مجتہد' ایک شرعی اصطلاح ہے، لہٰذا اس سے پرہیز بہتر ہے۔ ان کو ہماری بات پر بہت غصہ آیا اور انہوں نے نوائے وقت میں تین چار قسطوں میں ہمارے خوب لتّے لیے۔ بعد میں انہوں نے اپنی کتاب میں بھی وہ مضامین شامل کیے۔ سو مختار فاروقی صاحب بھی اگر اقبال کو مفکر، مصلح،

پیامبر، مجدد، مجتہد، رہبرِ انقلاب اسلامی وغیرہ سمجھتے ہیں تو ہم اس پر معترض کیوں ہوں؟

۴۔اس خصوصی شمارے کا عنوان ہی 'ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی اقبال شناسی' ہے اور اس موضوع پر شمارے میں ۳۳۶ صفحات میں وقیع مواد جمع کیا گیا ہے جس میں ایک پی ایچ ڈی مقالے کے استناد کی بنیاد پر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کی آٹھ کتابیں ان کی زندگی میں شائع ہوئیں جن میں سے ایک اقبال پر تھی۔ انہوں نے قومی وبین الاقوامی کانفرنسوں میں ۱۲ مقالات پڑھے جن میں سے کوئی اقبال پر نہیں تھا۔ انہوں نے ۲۱ تحقیقی مقالات لکھے جن میں سے اقبال پر دو اردو کے مضامین تھے اور چار انگریزی کے (دیکھیے صفحہ ۱۹۰ و مابعد)۔اس کی بنیاد پر اگر انجینئر صاحب یہ مقدمہ قائم کرتے ہیں کہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کی فکر اور شخصیت کا مرکزی نکتہ اقبال شناسی اور کلام وفکرِ اقبال کی شرح وتوضیح تھا تو اس کا حق ان سے کون چھین سکتا ہے؟

۵۔ ہم بحیثیت ایک طالب علم کے یہ سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کی فکر وشخصیت کا مرکزی نکتہ مغربی فکر وتہذیب کا مدلل علمی ردّ اور اس کے مقابلے میں اسلام کی علمی وفکری برتری کا اثبات تھا۔ زندگی کے آخری دور میں البتہ انہوں نے ساری توجہ تعلیم کی اسلامائیزیشن کی طرف مبذول کر لی تھی۔ اس کے لیے انہوں نے آل پاکستان تعلیمی کانگرس قائم کی، اسلامک ایجوکیشن کے نام سے اردو اور انگریزی مجلہ کا آغاز کیا، بطور نمونہ سائنس کی ایک نصابی کتاب بھی لکھی اور وہ اسی پر باقی زندگی لگانا چاہتے تھے لیکن موت نے انہیں اس کی مہلت نہ دی۔

ہم افسوس سے یہ اقرار کرتے ہیں کہ ان کے بعد ہم پاکستانیوں نے اور خصوصاً ہماری دینی قوتوں نے ان دونوں موضوعات پر کام کو آگے نہیں بڑھایا۔ مغربی فکر وتہذیب کو ردّ کرنے اور اس کے مقابلے میں اسلام کی علمی وفکری برتری کے کام کے لیے ہماری جامعات اور علمی ادارے بانجھ ہو گئے اور دنیا پر مغربی فکر وتہذیب کے غلبے نے ہماری آنکھوں کو خیرہ اور دماغوں کو سُن کر دیا۔ تعلیم کے ایک متوازن اور اسلامی تصور کو ہماری دینی قوتوں نے دعوت واصلاح اور تعمیرِ فرد، معاشرہ اور ریاست کا ذریعہ بنایا ہی نہیں۔ اور اس مقصد کے لیے تعلیم کی اسلامائیزیشن کا کام کرنے کی بجائے ہماری دینی قوتوں کے قائم کردہ تعلیمی ادارے اب مغربی فکر وتہذیب کے فروغ کے کام میں لگ گئے ہیں اور مغرب کی فکری غلامی کی زنجیریں پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئی ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون. اس پر ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی روح ضرور ہی عالم بالا میں تڑپتی ہو گی لیکن ہم دیگر اہم کاموں میں مصروف بلکہ مگن ہیں اور ان دو کاموں کے لیے ہمارے پاس نہ وقت ہے نہ توجہ اور نہ افرادی ومادی وسائل۔ (بقیہ صفحہ ۴۳ پر)